ایمان بالرّسالت

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

منہاج القرآن پبلیکیشنز

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

کتاب	:	ایمان بالرسالت
تصنیف	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب وتدوین	:	ضیاء نیر
پروف ریڈنگ وتخریج	:	عبدالجبار قمر
اشاعت اول	:	جنوری ۱۹۸۹ء (۲ ہزار)
اشاعت دوم	:	اکتوبر ۱۹۹۴ء (۲ ہزار)
اشاعت سوم	:	مئی ۲۰۰۰ء
تعداد	:	گیارہ سو
کمپوزنگ	:	محمد یامین
نگران طباعت	:	محمد جاوید کھٹانہ
مطبع	:	منہاج القرآن پرنٹرز

نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات ولیکچرز کے ریکارڈ شدہ آڈیو/ویڈیو کیسٹس سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے **تحریک منہاج القرآن** کے لئے وقف ہے۔

ڈائریکٹر پریس اینڈ پبلی کیشنز

ISBN 969-32-0067-5

نوٹیفیکیشن

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفیکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۴۔۱/۸۰ پی آئی وی مورخہ ۳۱ جولائی ۸۴، گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷۔۴۔۱۲۰ ای جنرل وایم ۴/۰-۹۷۰۷-۳-۷ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء، شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۔۶۷/این۔۱/۱ اے ڈی (لائبریری) مورخہ ۳۰ اگست ۸۶ء اور آزاد حکومت ریاست جموں وکشمیر مظفر آباد کی چٹھی نمبر س ت / انتظامیہ / ۶۳۔۸۰۶۱/۹۲ مورخہ ۲ جون ۹۲ء کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کالجوں اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	**نظام رسالت اور اسکی ضرورت:**	۹
	ایمان بالرسالت کے سلسلے میں دو بنیادی مباحث:	۱۱
۲	**ا۔ اسلام کا تصور رسالت**	۱۱
	عمومیت رسالت	۱۲
	ایک نبیؑ ایک قوم	۱۳
	ایک نبی اور کل کائنات	۱۴
۳	**ب۔ ضرورت رسالت**	۱۶
	ضرورت رسالت کی چار جہتیں	۱۶
۴	**(۱) انسان کا مقصد تخلیق اور ضرورت رسالت:**	۱۶
	سائنس اور اسلام	۱۸
	مقصد تخلیق کائنات	۱۹
	مقصد تخلیق اور رسالت	۲۰
۵	**(۲) نسل انسانی کی جوابدہی کا تصور اور ضرورت رسالت:**	۲۱
	تکمیل حوائج	۲۲
۶	**(۳) انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورت رسالت:**	۲۵
	ذرائع علم کی اقسام	۲۵
۷	**ا۔ حواس خمسہ ظاہری:**	۲۶
	حواس خمسہ کا ایک دوسرے کی جگہ لینا محال ہے	۲۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	حواس ظاہری کا دائرہ محدود ہے	۲۷
	حواس خمسہ کی تمثیل	۲۸
	انسانی جسم میں عقل کی حیثیت	۲۹
	تحصیل علم میں عقل کی حیثیت	۳۰
۸	**ب۔ حواس خمسہ باطنی:**	۳۱
	۱۔حس مشترک	۳۱
	۲۔حس خیال	۳۱
	۳۔حسن واہمہ	۳۲
	۴۔حس حافظہ	۳۲
	۵۔حس متصرفہ	۳۲
	انسان اور اس کی بساط علم	۳۳
۹	**ج۔ وجدان اور اس کے لطائف:**	۳۵
	علوم نبوت کا فیضان	۳۶
	مقصد رسالت ونبوت	۳۷
	ذرائع انسانی سے حاصل صدہ علم میں غلطی کا امکان	۳۸
	سائنسی علوم واکتشافات کی حیثیت	۳۸
	سائنس اور مذہب کی مطابقت	۴۰
	خلاصہ کلام	۴۱

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	مسلمان سائنس دانوں کے لئے لمحہ فکریہ	۴۲
۱۰	**(۴) انسان عمل کی تکمیل اور ضرورت رسالت:**	۴۲
	علوم نبوت کے عطا کئے جانے کی غرض وغایت	۴۲
	بعثت انبیاء کی غرض وغایت	۴۴
	اطاعت واتباع میں امتیاز	۴۵
	لفظ اتباع کے مفہوم میں مغالطہ	۴۶
	صرف اتباع رسول کیوں؟	۴۷
	حکم اور اس کا مفہوم	۵۰
	ایک لطیف علمی نکتہ	۵۰
	صلوۃ بمعنی دعا	۵۳
	زمانہ جاہلیت کی نماز	۵۴
	حج کا حکم اور طریق رسالت	۵۴
	نماز کی رکعتیں بھول جانے کا واقعہ	۵۵
	نماز میں بھول جانے کا مسئلہ	۵۷
	نماز میں حضور ﷺ کے بلانے کا مسئلہ	۵۷
۱۱	**سنت مصطفوی کی روشنی میں منشاء ایزدی کی تکمیل کی عملی مثالیں:**	۵۸
	عدل بین الازواج کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۵۸
	مخلوق پر رحم کرنے کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۵۹

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
	سچ بولنے کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۶۰
	ایفائے عہد کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۶۰
	سادہ زندگی کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۶۱
	محنت ومساوات کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل	۶۲
۱۲	**ایمان بالرسالت کے تقاضے:**	۶۵
	۱۔محبت رسول ﷺ	۶۹
	۲۔تعظیم رسول ﷺ	۷۲
	۳۔نصرت رسول ﷺ	۷۵
	۴۔اطاعت رسول ﷺ	۷۷
۱۳	اشاریہ	۷۹
۱۴	کتابیات	۹۹

نظام رسالت
اور
اس کی ضرورت

شہادت توحید ورسالت ارکان اسلام کا اولیں رکن ہے اس لئے توحید ورسالت کے بارے میں جاننا ہر مسلمان کا بنیادی فریضہ ہے۔ ایمان بالرسالت کے متعلق دو بنیادی مباحث درج ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام کا تصور رسالت

۲۔ ضرورت رسالت

۱۔ اسلام کا تصور رسالت:

اسلام ایک ترقی یافتہ مذہب ہی نہیں بلکہ عالمگیر اور آفاقی صفات کا حامل دین بھی ہے۔ اسلام نے دیگر مذاہب کے برعکس ''رسالت'' کا ایک ٹھوس اور جامع تصور پیش کیا' جس سے دوسری اقوام وملل کے دامن خالی ہیں۔ چنانچہ یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں رائج مذاہب عیسائیت و یہودیت سے لے کر مشرق بعید تک میں مروج ادیان تک اس وسیع تصور رسالت سے تہی دست وتہی داماں ہیں۔ اسلام نے نہ تو رسالت کو بڑھا کر خدا یا خدا کی اولاد کے درجے پر پہنچایا اور نہ گھٹا کر عام انسانوں کے برابر قرار دیا۔ دین مبیں نے رسالت ونبوت کا ایسا جامع و بے نظیر اور کامل و بے مثل نظریہ پیش کیا جس میں نور حق کی صداقت اور چمک دمک بخوبی دکھائی دے سکتی ہے۔

رسول کا لفظ ''ر۔س۔ل'' کے تین حرفوں سے بنا ہے۔ رسل کے معنی بقول امام راغب (صاحب مفردات) ''آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں'' اور لفظ رسول اسی سے مشتق ہے۔ صاحب لسان العرب کے بقول، یہ لفظ اس معنیمیں استعمال ہوتا ہے:

الذی یتابع اخبار الذی بعثه۔ جو اپنے بھیجنے والے کے احوال و واقعات کی متابعت کرے۔ (لسان العرب، بذیل رسل)

لفظ رسل میں فی الحقیقت اٹھنے اور چلنے کے دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ بقول امام راغب اصفہانیؒ لفظ رسول کا اطلاق بھی دو طرح ہوتا ہے، کبھی پیغام پر اور کبھی پیغام رساں پر۔

اصطلاح شریعت میں اس سے مراد خداوند قدوس کا اپنے مخصوص و برگزیدہ بندوں کے ذریعے نسل انسانی تک اپنا پیغام حق وصداقت پہنچانا ہے۔ اس اعتبار سے رسالت ایک وسیع کلیہ ہے، جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرور کائناتﷺ کی ذات اقدس تک تمام انبیاء و رسل کی نبوتیں اور رسالتیں شامل ہیں۔ ہر نبی اپنی اپنی جگہ حق وصداقت کا کامل و مکمل نمونہ رہا ہے اور ان سب نے ایک ہی مشن، ایک ہی مقصد اور ایک ہی لائحہ عمل کے تحت کام کیا ہے۔ اس بنا پر اسلام ان سب پر ایمان لانے کو ضروری اور لازمی قرار دیتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۔ سب (دل سے) اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور اسکے رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (البقرۃ ۲:۲۸۵)

عمومیت رسالت:

اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر خطے اور نسل انسانی کے ہر طبقے کی طرف اپنے رسول اور پیغمبر بھیجے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ O اور کوئی امت نہیں مگر اس میں کوئی نہ کوئی ہدایت کرنے والا ضرور گزر چکا ہے o (فاطر ۳۵:۲۴)

قرآن کریم کی یہ آیت عمومیت رسالت پر دلالت کرتی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کرہ ارض کا ہر وہ خطہ جہاں چند انسانوں نے مل کر معاشرہ (Society) تشکیل دیا ہے، اللہ کی طرف سے آنے والے انبیاء کے فیضان سے خالی نہیں رہا۔

ایک نبی.....ایک قوم:

اس سلسلے میں عمومیت اور وسعت اس حد تک ملتی ہے کہ ابتداء میں ایک نبی اور ایک قوم کا اصول جاری رہا۔اس سلسلے میں ارشاد باری ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡ۔	اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اپنی قوم کی زبان کے ساتھ تا کہ وہ ان کے لئے (پیغام حق) خوب واضح کر سکے۔
(ابراہیم،۱۴:۴)	

الفاظ "لیبین لھم" سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ خداوند قدوس کو اپنی مخلوق کی سہولت اور آسانی کا کس قدر خیال اور احساس تھا کہ اس نے دنیا کی جس قوم کو بھی اپنا پیغام پہنچانا چاہا تو پیغام رسانی کے لیے نبی یا رسول کو بھی اسی قوم میں سے منتخب کیا تا کہ وہ نبی یا رسول اس قوم کے افراد سے انہی کی زبان میں گفتگو کر سکے۔

یہ خدائی اصول دراصل اتمام حجت کا ایک ذریعہ تھا ارشاد خداوندی ہے۔

ا۔رُسُلًا مُّبَشِّرِيۡنَ وَمُنۡذِرِيۡنَ لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَالرُّسُلِ۔	رسول جو خوشخبری دینے والے اور ڈرسنانے والے تھے (اسلئے بھیجے گئے) تا کہ (ان) پیغمبروں کے (آجانے) کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔
(النساء،۴:۱۶۵)	

انبیاء انذار و تبشیر کے پہلوؤں سے کام لے کر لوگوں کو خدائی اصول اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔

۲۔وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ (الکہف ۱۸:۵۶)

اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجا کرتے مگر (لوگوں کو) خوشخبری سنانے والے اور ڈر سنانے والے (بنا کر)۔

اور پھر جب انبیائے کرام کے اِتمامِ حجت کے لئے تشریف لے آنے کے باوُجود بعض بد بخت اَقوام کے بگڑے ہوئے قلوب رُو بہ اِصلاح نہیں ہوتے، بلکہ وہ پیغامِ حق کو ٹھکرا کر اُن مُقدّس نفوس کی گستاخی کی مُرتکب ہوتی ہیں اور عمل کے اِعتبار سے فساد کی آخری حدوں کو چھونے لگتی ہیں تو اُس وقت تمام تنبیہات کے بعد اُن پر غضبِ اِلٰہی عذاب بن کر ٹوٹ پڑتا ہے۔ سورۂ بنی اِسرائیل میں ہے:

وَ مَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًاO (بنی اسرائیل ۱۷:۱۵)

اور ہم ہرگز عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ ہم (اس قوم میں) کسی رسول کو بھیج لیں o

اس کے برعکس جو لوگ ان انبیاء و رسل کی دعوت و تبلیغ سے اصلاح پذیر ہو جاتے ہیں ‘ان کی دنیا و آخرت کے سنور جانے کا واضح اشارہ دے دیا جاتا ہے۔

ایک نبی اور کل کائنات:

اِنذار و تبشیر اور دعوت و تبلیغ کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ انسان انبیاء کی تعلیمات کے اثر سے تہذیب و تمدن کے اوصاف سے متصف ہوتا گیا تو آہستہ آہستہ نبوت و رسالت کے اس نظام میں وسعت و آفاقیت پیدا ہوتی چلی گئی اور ایسے انبیاء جن کا دائرۂ تبلیغ صرف کرۂ ارضی کو محیط تھا‘ تشریف لا چکے تو کائنات ارضی و سماوی اور قیامت تک کے تمام ادوار کے لیے خاتم الانبیاء سرور کون و مکاں‘ فخرِ موجودات ﷺ کو مبعوث کر دیا گیا۔ اور وہ دنیا کے سب سے عظیم انقلاب اور سب سے بڑے دین کے داعی اور مبلغ اعظم قرار پائے۔ قرآن مجید نے حضور نبی کریم ﷺ کی اس شان

کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا۔	اور اے محبوب! ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے۔
(سبا ۳۴:۲۸)	

نیز فرمایا:

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرًاO	(وہ اللہ) بڑی برکت والا ہے جس نے (حق و باطل میں فرق اور) فیصلہ کرنے والا (قرآن) اپنے (محبوب و مقرب) بندہ پر نازل فرمایا تا کہ وہ تمام جہانوں کے لئے ڈر سنانے والا ہو جائےO
(الفرقان ۲۵:۱)	

خدا تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دامن کو عالمین کی ہدایت کے سامان کے ساتھ ساتھ آفاقی و کائناتی رحمتوں سے بھی بھر دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ سے ظاہر ہے:

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَO	اور (اے رسول محتشم) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کرO
(الانبیاء ۲۱:۱۰۷)	

اب جس طرح تمام جہانوں کا پروردگار ایک ہی ہے۔ اسی طرح کل کائنات ایک حضور خاتم النبین ﷺ کے پرچم رحمت تلے جمع کر دی گئی۔ اور یوں توحید باری کے ساتھ ساتھ رسالت کا تصور بھی اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ صرف یہی نہیں کہ آپ کی رسالت آپ کے زمانے اور اسکے مابعد کے ادوار کے لیے ہے بلکہ آپ ﷺ سے پہلے کے زمانے بھی آپ ﷺ کی دسترس نبوت سے باہر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت کے روز جب امتوں پر گواہی درکار ہو گی تو ان کے انبیاء کو بلایا جائے گا، اور جب ان انبیاء کی شہادت پر گواہی درکار ہو گی تو حضور ﷺ کا نام پکارا

جائے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا O

پھر اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امتے ایک گواہ لائیں گے اور (اے حبیب) ہم آپ ﷺ کو ان سب پر گواہ لائیں O

(النساء ۴:۴۱)

۲۔ضرورتِ رسالت:

تصور رسالت کے جاننے کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ نظام رسالت کے عوامل کیا ہیں؟ اور نظامِ رسالت ونبوت کی ضرورت واہمیت کیا ہے؟

اس مسئلے کو ہم چار جہتوں کے حوالے سے سمجھ سکتے ہیں۔

(۱) انسان کا مقصدِ تخلیق اور ضرورت رسالت

(۲) نسلِ انسانی کی جوابدہی کا تصور اور ضرورتِ رسالت۔

(۳) انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورتِ رسالت۔

(۴) انسانی عمل کی تکمیل اور ضرورتِ رسالت

۱۔انسان کا مقصدِ تخلیق اور ضرورت رسالت:

ایک مشہور عربی ضرب المثل ہے:

فعل الحكيم لايخلوا عن الحكمة۔

دانا کی کوئی بات حکمت سے خالی نہیں ہوتی۔

اس اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے ہر کام کی کوئی نہ کوئی غرض اور کوئی نہ کوئی جہت ضرور ہوتی ہے۔ اگر کسی کام کی کوئی جہت نہ ہو تو اسے عبث، بیہودہ اور محض فعلِ صبیان جیسے ناموں سے پکارا جاتا ہے، جو کسی بھی عاقل و بالغ شخص کے لیے عیب کی حیثیت رکھتی ہے، اسی

لیے انسان کے تمام سماجی و معاشرتی، معاشی و اقتصادی اور سیاسی و اخلاقی منصوبے، تمام علوم فنون اور روزمرہ کے جملہ مشاغل و سرگرمیاں با مقصد (Purposive) ہیں اور انسان اپنے کسی ادنیٰ فعل کے لیے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ اس کا یہ کام مقصد و حکمت سے خالی ہے۔ اگر انسان کی یہ حالت ہے جو خدا کے مقابلے میں ''لاشئ'' کی حیثیت رکھتا ہے تو خدا تعالیٰ کے متعلق یہ کیونکر باور کر لیا جائے کہ اس کی اتنی بڑی تخلیق بے مقصد اور بے فائدہ ہے؟

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تخلیق کائنات اور خود تخلیق انسان کے متعلق موجودہ سائنس کا یہ نظریہ ہے کہ یہ تخلیق محض ایک حادثہ (Incident) اور اتفاق (Chance) ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ آفرینش کائنات کے وقت مختلف اقسام کی گیسیں گردش کر رہی تھیں، پھر وہ باہم الگ تھلگ اور ٹھوس ہو کر، کچھ منور اجسام میں بدل گئیں اور کچھ تاریک یعنی روشن اجسام میں۔ اس طرح یہ کائنات (معاذ اللہ) از خود وجود میں آ گئی۔ قطع نظر اس کے کہ ہمارے مذہب نے ہمیں کیا تعلیم دی ہے، قابل غور بات یہ ہے کہ آیا کائنات کی کوئی چیز بھی خود بخود وجود میں آ سکتی ہے۔ پھر سائنس خود ''افعال کے اسباب و علل کی تلاش و جستجو'' کا نام ہے۔ اگر زمین کا ایک پتا بھی ہلتا ہے تو سائنس اس کا کوئی نہ کوئی سبب (Cause) بیان کرتی ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اتنے بڑے کارخانہ قدرت کی تخلیق بے سبب ہو۔

اسی بناء پر خالق و مالک نے مظاہر قدرت میں غور و فکر کرنے اور ان سے کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد دریافت کرنے پر زور دیا ہے ارشاد ہوتا ہے:

۲. اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَکُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنۡ شَیۡءٍ۔ (الاعراف، ۷:۱۸۵)	کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں اور (علاوہ انکے) جو کوئی چیز بھی اللہ نے پیدا فرمائی ہے (اس میں) نگاہ نہیں ڈالی (اور غور نہیں کیا)

نیز فرمایا:

۲. اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنَا كُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَاتُرْجَعُوْنَ O (المومنون، ۲۳:۱۱۵)

سو کیا تم نے یہ خیال کر لیا تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار (و بے مقصد) پیدا کیا اور یہ کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے o

جب انسان کائنات کی آیات بینات پر نظر ڈالتا ہے اور اسے فعل خداوندی کی صحیح معرفت نصیب ہوتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ (آل عمران، ۳:۱۹۱)

اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا o

وہ کائنات کے سینے پر دھڑکتے ہوئے دل کی آواز سنتا ہے، اس کی نگاہیں تمام موجودات عالم کے حجابات کو چیر کر اپنے خالق و مالک کو پہچان لیتی ہیں، اور پھر اسکے دل میں اسی آقا و مولا کی یاد انگڑائیاں لینے لگتی ہے تو قرآن مجید انسان کی اس حالت کو یوں بیان فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۔ (البقرۃ، ۲:۱۶۵)

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔

سائنس اور اسلام:

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ عام طور پر مذہبی اعتقادات اور سائنسی اکتشافات کے درمیان تصادم (Clash) نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے کہ سائنسی تحقیق (Scientific Research) کا زاویہ اور دائرہ کار مذہبی عقائد و فکر کے زاویے اور دائرہ کار سے قطعی مختلف ہے۔ مذہب بابعد الطبعیاتی حقائق سے بحث کرتا ہے، جبکہ سائنس کی تحقیق کا دائرہ کار طبعی زندگی کے نظارے (Phenomena of Physical World) تک محدود ہے۔

مذہب وحی ربانی کی قوت سے مکان اور لامکان کی بے کنار وسعتوں میں پرواز کرتا ہے اور سائنس کائنات ارضی کی فضاؤں میں محصور ہے۔ تاہم بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جہاں قرآن وحدیث نے ایک حقیقت(Fact) اور نظریے(Theory) کو صراحت سے بیان کر دیا ہے اور وہ حکم قطعی الثبوت بھی ہے۔ ایسے اسلامی نظریے کے خلاف سائنس کی کوئی بھی شاخ کوئی نظریہ پیش کرنے کی جسارت کرے تو اسے کسی صورت میں بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء ہو یا لومبر وسو کا فلسفہ جرمیات' حیوانیات کا کوئی موقف ہو یا حیاتیات کا کوئی فیصلہ' ہم مذہب کے صریح حکم کے مقابلے پر اسے قطعاً قبول نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ ہر سائنسی تحقیق طویل مدت گزر جانے کے باوجود اقدام وخطا(Trial & Error) کے رخ پر زیر تحقیق ہی رہتی ہے اور مسلمہ حقیقت کم ہی بنتی ہے' جبکہ مذہب اور اس کے معتقدات تحقیق وتفتیش سے ہمیشہ بالاتر رہتے ہیں۔

مقصدِ تخلیقِ کائنات:

بہرحال جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کائنات کو اللہ تعالیٰ ہی نے تخلیق کیا ہے' تو پھر اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یقیناً اس کائنات کی تخلیق کا کوئی مقصد ہوگا۔ چنانچہ قرآن حکیم اس تصور کو یوں اجاگر کرتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَO	اور میں نے جن اور انسانوں کو پیدا ہی عبادت کے لئے کیا ہےo

(الذاریات' ۵۱:۵۶)

اور پھر انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے رب العزت کی شایان شان بندگی بجالانے کے لئے بہترین صورت پر پیدا کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ O (التین ۹۵:۴)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہےo

اس سلسلے میں انسان کو ایک اور مقام پر ان الفاظ میں تنبیہہ کی گئی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ O الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ O فِیْ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ O (الانفطار ۸۲:۶۔۸)

اے انسان! تجھ کو اپنے رب کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیاo (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضا کو درست کیا اور تیری قامت کو معتدل رکھاo پھر جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیاo

مقصدِ تخلیق اور رسالت:

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اس کائنات اور اس میں بسنے والی اہم ترین مخلوق انسان کو خدا نے ہی پیدا کیا اور اسی نے تمام حوائج انسانی کی تکمیل فرمائی۔ اسی نے انسان کو اس کے وہم و گمان سے بڑھ کر نعمتوں اور احسانات سے نوازا اور پھر اس کی تخلیق کا مقصد یہ قرار دیا کہ اس کی عبادت کی جائے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا خدا نے انسان تک اس کا مقصدِ تخلیق پہنچانے کا کوئی انتظام بھی کیا ہے یا نہیں۔ عقل یہ بات ماننے کے لئے تیار رہیں کہ انسان کی تخلیق تو با مقصد ہو مگر اسے اس کے مقصد حیات سے آگاہ کرنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا ہو۔ اس سے تو (معاذ اللہ) خدا کی ذات والا صفات پر الزام آتا ہے کہ اس نے اتنی وسیع و عریض کائنات پیدا تو کر دی، پھر کائنات اور حضرت انسان میں ربط بھی پیدا کر دیا، مگر اسے یہ بتانے کا کوئی انتظام نہیں کہ اسکا مقصدِ تخلیق کیا ہے؟ اس کائنات میں اور خود اس کائنات کا اس کے دل و دماغ میں مقام اور درجہ کیا ہونا چاہیے۔ آیا انسان کائنات اور اس کے موجودات کی خدمت و پرستش کے لیے ہے یا کائنات

خوداسکی خدمت واطاعت کے لیے ہے؟ اور یہ کہ یہاں اسے کیسے گزراوقات کرنی ہے؟ کس کا حکم ماننا ہے؟ کس کانہیں ماننا؟ اسی کو احسن پیرائے میں سورۃ انعام میں یوں بیان فرمایا ہے:

وَمَا قَدَرُوْاللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ ۔ (الانعام۶:۹۱)

اورانہوں نے (یعنی یہود نے) اللہ کی وہ قدر نہ جانی جیسی قدر جاننا چاہیے تھی۔جب انہوں نے یہ کہہ (کر رسالت) محمدی کا (انکار کر) دیا کہ اللہ نے کس آدمی پر کوئی چیز نہیں اتاری۔

گویا یہ کہہ دینا کہ خدا نے اس دنیا کی مادی وجسمانی حوائج کی تکمیل کی ہے مگر روحانی و باطنی ضروریات کو تشنہ چھوڑ دیا' ذات خداوندی کی سخت ناقدری اور ناشکری کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہے کہ کوئی شخص کسی کو ملازم تو رکھ لے مگر اسے اس کے حقوق وفرائض سے آگاہ نہ کرے' اسے یہ نہ بتائے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کس کام سے بچنا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر خداوند تعالیٰ انسان کو اسکے فرائض و واجبات سے آگاہ نہ فرمائے تو وہ اپنی اس شاہکار تخلیق میں (معاذ اللہ) کہاں تک صاحب حکمت ہوسکتا ہے:

بہرحال انسان کو اس مقصد حیات اوراس کی تخلیق کی غرض وغایت سمجھانے کے لیے عقل سلیم نظام رسالت کو ناگزیر سمجھتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے پورا فرمادیا ہے۔

۲۔نسلِ انسانی کی جواب دہی کا تصوراورضرورتِ رسالت:

قاعدہ ہے کہ ہر بامقصد شے کا سفر حیات کسی نہ کسی منطقی انجام تک ضرور پہنچتا ہے اورجس پر کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے اس سے مناسب وقت پر جواب طلبی بھی ضرور کی جاتی ہے۔ روزمرہ زندگی کی مثالیں اس کا واضح ثبوت ہیں۔ ملازم جس کام پر مامور ہوتا ہے اگر اس سے اس کے مالک کا جواب طلبی کرنا بجا ہے تو خدائے علیم وخبیر کا

انسان سے جواب طلبی کرنا کیوں ضروری قرار نہیں پاتا؟ جب کہ رب العزت نے انسان کی تمام طبعی اور جسمانی حوائج کی اسطرح تکمیل فرمائی ہے کہ بڑے سے بڑا آقا بھی اپنے غلام کو ان سہولیات کا عشر عشیر بھی فراہم کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

تکمیلِ حوائج:

ذرا غور کیجیے کہ خدا نے کس طرح حوائج انسان کی تکمیل کی انسان کا سب سے پہلا مسئلہ قرارگاہ اور حصول معاش تھا' جو اسے دیا گیا۔

وَلَکُمۡ فِی الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍO (البقرہ۲:۳۶)	اب تمہارے لئے زمین میں ہی معینہ مدت تک جائے قرار ہےo

اس کا دوسرا مسئلہ مسئلہ زندگی کی ضروریات اور آسائشوں کا تھا' وہ بھی اس صورت میں پورا کردیا گیا:

وَّ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًاO لِّنُخۡرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًاO وَّ جَنّٰتٍ اَلۡفَافًاO	اور ہم نے نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایاo تا کہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریںo اور گھنے گھنے باغ لگائیںo

(النباء۷۸:۱۴-۱۶)

انسان کی ایک طلب یہ ہوتی تھی کہ اسے ماحول کا جائزہ لینے اور اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع دیا جائے' یہ بھی درج ذیل طریقے سے پوری کردی گئی:

اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَیۡنَیۡنِ O وَ لِسَانًا وَّشَفَتَیۡنِO	بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیںo اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئےo

(البلد۹۰:۸-۹)

انسان کو بھرپور زندگی گزارنے کے لیے اعضا و جوارح کی ضرورت تھی' وہ بھی عطا کر

دیئے گئے:

وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَ الۡاَفۡئِدَۃَ ۔	اور اس نے تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنایا۔
(الملک‘ ۶۷:۲۳)	

اس کے علاوہ انسان کو خیر و شر میں تمیز کے لیے فہم و بصیرت درکار تھی جو اسے مرحمت فرما دی گئی۔

وَھَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ O	اور اس کو خیر و شر کے دونوں راستے
(البلد‘ ۹۰:۱۰)	دکھائے o

نیز فرمایا:

فَاَلۡھَمَھَا فُجُوۡرَھَا وَتَقۡوٰھَا ۔	اور اسے ہر چیز کے باب میں برائی اور
(الشمس‘ ۹۱:۸)	اچھائی کے دونوں پہلوؤں کا شعور عطا کیا گیا۔

پھر اس کی یہ خواہش تھی کہ اسے اپنی تگ و دو کا پورا پورا صلہ میسر آئے۔ یہ خواہش بھی پوری کی گئی۔

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی O	اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی
(النجم‘ ۵۳:۳۹)	اس نے کوشش کی ہوگی o

اب غور کیجیے‘ جس خدا نے انسان کی تمام ضروریات‘ جملہ خواہشات پوری کیں‘ اسے کھانے‘ پینے‘ پہننے اور زندگی بسر کرنے کو قسم قسم کی چیزیں دیں وہ خدا کیا انسان کو بغیر جواب طلب کیے چھوڑ دے گا ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًیO	کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یونہی
(القیامۃ‘ ۷۵:۳۶)	چھوڑ دیا جائے گا o

دنیا میں رہتے ہوئے ہر شخص کو بعض اوقات اس کے اعمال کا خاطر خواہ بدلہ نہیں ملتا' کیونکہ اس طرح اس دنیا کے آزمائش گاہ ہونے کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا اس مقصد کے لیے موت اور مابعد الموت کی زندگی رکھی گئی ہے' تاکہ انسان یہاں جو کچھ کرے اس کی آخری اور حتمی جزا و سزا اگلی دنیا میں دی جا سکے۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت انسان کی تخلیق با مقصد ہے۔ زندگی بھی با مقصد ہے اور موت بھی با مقصد ہوگی۔ زندگی انسان کو وسائل مہیا کرتی ہے تو موت ان کے استعمال پر ٹھیک ٹھیک جزا و سزا فراہم کرے گی۔

قیامت کے دن انسان کی تمام چالاکیاں اور عیاریاں دھری کی دھری رہ جائیں گی۔ وہاں فقط سچائی اور ایمان و اعمال کی درستی ہی اس کے کام آئے گی۔

اب یہ بات قابل غور ہے کہ جب خدا نے دنیا کو دار العمل بنایا' انسان کے اعمال کی جزا و سزا کا ایک مرحلہ اس دنیا میں رکھا اور حتمی فیصلے کے لیے موت کے بعد کی زندگی کو مخصوص کر دیا۔ تو کیا اس دنیا میں رہتے ہوئے انسان کو اس کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرنے کا بھی خدا تعالیٰ کی طرف کوئی نظام مقرر کیا گیا ہے یا نہیں؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے نسل انسانی کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کا کوئی بندوبست نہیں کیا تو جزا و سزا کا یہ سارا نظام بے معنی ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو کسی انسان پر رتی برابر بھی ظلم روا نہیں رکھتا۔ اس کا اعلان یہ ہے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا۔ (الانبیاء ۲۱:۴۷)	اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو کھڑی کریں گے تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

وہ بھلا کیونکر گوارا فرمائے گا کہ جس انسان کو زبانی ہدایات کا کوئی ضابطہ ہی مہیا نہیں کیا گیا' اس سے مواخذہ فرمائے۔

اگر کسی ملازم کو اس کے کام اور فرائض کی نشاندہی کرنے والی ہدایات سے محروم رکھا گیا ہو تو اسکے مالک کو اس سے مواخذہ کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے؟ ہم اپنے ملازمین کو پہلے ہدایت

کا چارٹر دیتے ہیں، پھر وقت آنے پر اسی چارٹر کی بناء پر اس سے جواب طلبی کرتے ہیں۔ پھر خدا تعالیٰ جو بڑا رحیم و کریم ہے اس کی نسبت یہ کیونکر باور کرلیا جائے کہ وہ کوئی ضابطہ دیئے بغیر انسان سے روز قیامت کو جواب طلبی فرمائے گا اور کوئی کام کرنے یا نہ کرنے کی تفصیل سے آگاہ کیے بغیر انسان کو اس کے افعال پر جزا و سزا دے گا۔ لہذا انسان کو اس کے حقوق و فرائض، آزادیوں اور ذمہ داریوں کی تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے نظام رسالت کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

(۳) انسانی علم کی کم مائیگی اور ضرورت رسالت:

اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کو باقاعدہ ایک مقصد کے تحت تخلیق فرمایا ہے، اس لیے اسے اپنے ماحول اور گردو پیش سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے ذرائع (Sources of knowledge) بھی عطا فرمائے ہیں اور علم کے ذرائع کا استعمال اور اس کے مقاصد کو بھی واضح کر دیا تا کہ انسان اپنے لئے خیر و شر کے تعین میں فیصلہ آسانی سے کر سکے۔

قرآن کریم میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

انسان کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے طاقتور دماغ، دیکھنے کے لیے صاف شفاف آنکھیں، سننے کے لیے حساس کان، چکھنے کے لیے زبان، سونگھنے کے لیے ناک، چھونے کے لیے ہاتھ اور احساس، لمس کے لیے، عصاب بخشے گئے۔ ان ذرائع کو بالعموم ہر انسان کے لیے کھلا رکھا ہے انہیں محدود اور مسدود نہیں فرمایا۔

انسان کو ذرائع علم عطا کیے جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ بھرپور طریقے سے کائنات میں زندگی بسر کر سکے۔ مخلوقات اور ان کے خواص و اوصاف کو جانے، ان کی حقیقت ادراک کرے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے مختلف زاویوں سے غور و فکر کر سکے۔

ذرائع علم کی اقسام:

اس مقصد کے لیے بلاتمیز رنگ و نسل انسان کو جو ذرائع علم عطا کیے گئے ہیں، انہیں تین

حصوں تقسیم کیا گیا ہے۔

الف۔حواسِ خمسۂ ظاہری:

حواس کی پہلی قسم حواس خمسہ ظاہری کہلاتی ہے، جن کی تعداد پانچ ہے ان کے ارتقاء کا سفر عمر کے ساتھ ساتھ جاری رہتا ہے۔

۱۔قوتِ لامسہ (چھونے کی قوت)

۲۔قوتِ باصرہ (آنکھوں سے دیکھنے کی قوت)

۳۔قوتِ سامعہ (کانوں سے سننے کی قوت)

۴۔قوتِ ذائقہ (زبان سے چکھنے کی قوت)

۵۔قوتِ شامہ (ناک سے سونگھنے کی قوت)

یہ وہ پانچ ذرائع علم جن کی بدولت انسان اپنے گردوپیش اور ماحول سے اپنا تعلق قائم رکھتا ہے مگر یہ حواس صرف ظاہری دنیا (Physical World) کی حقیقتوں کو جاننے اور ان کا ادراک کرنے تک محدود رہتے ہیں۔ یہ حواس انسانی ذہن کو فقط ظاہری خام مواد مہیا کرنے پر مامور ہیں۔قوتِ لامسہ کا کام کسی چیز کو چھو کر یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ چیز کیسی ہے؟ نرم و گداز ہے یا سخت اور کھردری۔لیکن اگر کوئی چیز غیر مادی جسم رکھتی ہے تو ہاتھ کوشش کے باوجود اس کے وجود کا سراغ نہیں لگا سکتے۔اس طرح قوت باصرہ کا کام مرئی اشیاء کو دیکھنا اور ان کے وجود کا سراغ لگانا ہے، لیکن آنکھ اسی وقت جسم کا سراغ لگا سکتی ہے، جب کوئی چیز دیکھے جانے کے قابل ہو۔اگر کوئی چیز غیر مرئی ہے تو اس کو قوت باصرہ معلوم نہیں کر سکتی۔علی ہذا القیاس قوت سامعہ کا کام آواز کا پتہ لگانا ہے خوشبو یا بدبو کو قوت شامہ کے ذریعے جانا جاتا ہے۔مٹھے یا کڑواہٹ کا احساس قوت ذائقہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔(اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ غیر حسی اور غیر مادی اشیاء کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ موجود ہیں تو ہمیں دکھائی نہیں دیتیں، نا سمجھی کی بات ہے کیونکہ ہمارے

حواس اس غیر مادی اشیاء کو جاننے اور انکا ادراک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔

حواسِ خمسہ کا ایک دوسرے کی جگہ لینا محال ہے

جو چیز آنکھ کے ذریعے معلوم کی جاسکتی ہے، وہ کسی اور حس کے ذریعے نہیں جانی سکتی مثلاً کوئی شخص آپ کے قریب آ کر بیٹھ جائے اور آپ آنکھیں بند کرلیں تو اپنے بقیہ چاروں حواس استعمال کرنے کے باوجود آپ کسی صورت میں بھی اس شخص کے وجود کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی قوت سامعہ مفقود ہو جائے تو وہ بقیہ چاروں حواس کو آزمانے کے باوجود آواز سراغ لگانے سے قاصر رہتا ہے۔ اگر زبان ذائقے کا پتا نہ چلا سکے تو آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ پاؤں سلامت ہونے کے باوجود بھی وہ مختلف ذائقوں میں تمیز نہیں کرسکتا اس سے بھی انسان اور اس کے حواس کی بے بسی عیاں ہو جاتی ہے کہ انسان کو جن حواس پر ناز ہے اور جن کے متعلق اس کا خیال ہے کہ وہ ان سے ہر حقیقت جان اور پرکھ سکتا ہے، ان کی حالت تو یہ ہے کہ اگر خود ان میں سے کوئی حس مفقود ہو جائے تو مل کر بھی اسکی تلافی نہیں کر سکتے۔

حواسِ ظاہری کا دائرہ محدود ہے:

اب ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ہر حس کا ایک مخصوص دائرہ اور حلقہ ہوتا ہے جو اشیاء حواس ظاہری کے ذریعے معلوم کی جاتی ہیں انہیں ادراکات حسی کہتے ہیں۔ جو شے جس حاسے کے دائرہ کار میں آتی ہے اسے ہمیشہ اسی حاسے کی مدد ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس حاسے کی بجائے اس پر حواس آزمائے جائیں تو ہزار کوششوں کے باوجود اس چیز کی صحیح ماہیت اور حقیقت کا ادراک ناممکن ہوتا ہے۔

آواز کو کان کے ذریعے معلوم کیا جائے گا تو وہ سمجھ میں آسکتی ہے۔ رنگوں کو آنکھوں کے ترازو میں تولا جائے گا تو ان میں امتیاز کیا جاسکتا ہے۔ خوشبو کو قوت شامہ کے ذریعے معلوم کیا جائے گا تو وہ انسانی ادراک میں آسکتی ہے، لیکن مذکورہ بالا حواس کے علاوہ اسی چیز کو کسی

دوسرے حاسے کی مدد سے جاننے کی کوشش بیکار ثابت ہوگی۔
طے پایا کہ اگر کوئی وجود دنیا میں موجود ہے مگر اس کو معلوم کرنے والی خاص حس موجود نہیں۔تو پھر باقی سارے حواس آزمانے کے باوجود اس وجود کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔

حواسِ خمسہ کی تمثیل:

مولانا رومؒ نے اس بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے بڑی عمدہ مثال دی ہے۔ فرماتے ہیں کسی جگہ پانچ اندھے تھے انہوں نے ساری زندگی ہاتھی کو نہیں دیکھا تھا' ایک مرتبہ ہاتھی کو ان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔اور ہر ایک سے کہا گیا کہ باری باری ہاتھ سے چھو کر بتاؤ کہ ہاتھی مجموعی طور پر کیسا ہوتا ہے۔ ہر ایک نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے اس ہاتھی کو جاننے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس کوشش کے نتیجے میں ایک نابینا نے اپنا ہاتھ ہاتھی کی ٹانگوں پر رکھا تو اس نے خیال کیا کہ ہاتھی تو ستونوں کی طرح ہوتا ہے۔ایک نے اپنے ہاتھ سے ہاتھی کے کان کو ٹٹولا تو اس نے گمان کیا کہ ہاتھی تو پنکھے کی طرح ہوتا ہے' اسی طرح کسی نے سونڈ پر ہاتھ لگایا تو اس نے کہا کہ ہاتھ تو رسے کی مانند ہوتا ہے۔

الغرض پانچوں کے پانچوں نابینا نے اپنے تمام تر حواس آزمانے کے باوجود' اتنے بڑے وجود (ہاتھی) کے صحیح ادراک سے قاصر رہے۔وجہ صرف یہ تھی کہ جس حاسے کی مدد سے اس وجود کو جانا جا سکتا تھا' یہ لوگ اس سے محروم تھے اور اس کی عدم موجودگی میں دوسرے تمام حواس آزمانے کے باوجود انہیں ہاتھی کی شکل وصورت معلوم نہ ہو سکی۔اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ:

اولاً: حواس خمسہ صرف دنیا کی اشیا (Phsical World) کا ادراک کر سکتے ہیں جس میں مادہ بھی شامل ہے اور توانائی بھی۔

ثانیاً: ہر حس کا ایک مخصوص دائرہ کار ہے۔جو چیز اس دائرے میں آ جائے وہ حس فقط اسی کو محسوس کر سکتی ہے' لیکن جو چیز اس حس کے دائرے سے باہر ہو' اس چیز کا صحیح ادراک تمام حواس مل کر بھی

نہیں کر سکتے۔

انسانی جسم میں عقل کی حیثیت:

ایک اور قابل توجہ امر یہ ہے کہ اگر پانچوں حواس درست اور سلامت ہوں، لیکن انہیں عقل کی سرپرستی حاصل نہ ہو تو یہ پانچوں حواس کسی چیز کو ٹھیک ٹھیک محسوس کرنے کے باوجود انسان کو کسی خاص نتیجے تک نہیں پہنچا سکتے۔ ان سے حاصل شدہ مواد کو خام مال (Raw Material) یا ادراک (Preception) تو کہہ سکتے ہیں، علم ہرگز نہیں قرار دے سکتے۔ یہ ادراک اور یہ احساس اسی وقت علم کا روپ اختیار کرتا ہے جب آنکھوں کی بصارت، کانوں کی سماعت، ہاتھوں کے لمس اور زبان کے ذائقے کا تاثر عقل پر وارد ہو اور عقل اس سے صحیح نتائج اخذ کر کے انسانی جستجو کو خاص نہج عطا کر دے اور اس ادراک کو منظّم کر دے۔ انسانی جسم مکمل طور پر ایک خود کار مشین کی طرح کام کرتا ہے اور اس میں دماغ کی حیثیت کمپیوٹر کی سی ہے۔ موجودہ تحقیقات سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو چکی ہے کہ دماغ پورے جسم انسانی کو کنٹرول کرتا ہے، اس کو ایک نظام کے تحت مربوط کرتا ہے اور ان سب میں ایک شعوری کیفیت جاری و ساری کرتا ہے۔ یہ تمام مراحل غیر محسوس طریقے پر خود کار نظام کے تحت یوں وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ انسان کو اس کا احساس بھی نہیں ہو پاتا۔ لیکن اگر ان تمام کیفیات کا تجزیہ کیا جائے تو پھر قدم قدم پر ارشاد ربانی کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا۔ (النحل، ۱۸:۱۶)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو انہیں شمار نہ کر سکو گے۔

انسانی جسم کے جس حصے میں یہ سب عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے، اسے دماغ کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بذات خود عقل کو ایک بہت بڑا کارخانہ (Factory) بنا دیا ہے۔

تحصیلِ علم میں عقل کا کردار:

جس طرح حواس ظاہری کے پانچ الگ الگ حصے ہیں' اسی طرح عقل کے بھی پانچ الگ الگ گوشے ہیں۔عقل کے یہ تمام تر حصے نہایت نظم وضبط اور باہمی افہام وتفہیم سے کام کرتے ہیں۔حواس خمسہ ظاہری جو کچھ محسوس کرتے ہیں' اس کے تاثرات جوں کے توں دماغ تک پہنچا دیتے ہیں۔عقل اپنے ان پانچوں شعبوں کی مدد سے ان تاثرات سے صحیح نتیجہ اخذ کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ کان نے کیا سنا' ہاتھوں نے کیا چھوا' زبان نے کون سا ذائقہ چکھا اور آنکھ نے کیا دیکھا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ان حواس کا کام دماغ کے لیے معلومات کا خام مواد تیار کرنا ہے۔ ان محسوسات کو سمجھنا نہیں۔کان بذات خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ سنے ہوئے الفاظ کا مطلب کیا ہے' آنکھ بذات خود فیصلہ نہیں کر سکتی کہ سرخ اور سبز رنگ میں کیا فرق ہے' ہاتھ اور زبان خود یہ نہیں بتا سکتے کہ فلاں چیز نرم ہے یا سخت' میٹھی ہے یا کڑوی آخری فیصلہ عقل انسانی صادر کرتی ہے' حواس خمسہ نہیں۔گویا علم کی آخری صورت گری عقل سے ہوتی ہے' حواس خمسہ سے نہیں۔

انسانی حواس کی بے بسی:

حواس ظاہری کا دائرہ کار پہلے ہی صرف مادی اور طبعی دنیا (Physical World) تک محدود تھا' غیر مادی اشیاء کا ادراک حواس ظاہری کے ذریعے ناممکن تھا۔یہ بات واضح ہوگئی کہ انسانی حواس کی معلوم کردہ اشیاء کو اگر عقل انسانی منظّم اور مربوط نہ کرے تو حواس خمسہ کے یہ تمام تاثرات علم کا روپ نہیں دھار سکتے (اس کی صحیح مثال کسی دیوانے یا پاگل کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے' جس کے تمام حواس اپنی اپنی جگہ درست اور صحیح وسالم ہوتے ہیں مگر دماغ ٹھیک کام نہیں کر رہا ہوتا' اس بناء پر اس کے حواس کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں اور صحیح علم وجود میں نہیں آتا۔

ب۔حواسِ خمسۂ باطنی:

جس طرح محسوسات ظاہری کے لیے قدرت نے پانچ حواس تخلیق فرمائے ہیں، اسی طرح عقل انسانی میں بھی پانچ مدرکات پیدا کیے گئے ہیں، جنہیں حواس خمسہ باطنی کہا جاتا ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱)حس مشترک:

انسانی عقل کا یہ گوشہ حواس ظاہری کے تاثرات کو وصول(Receive) کرتا ہے، حواس کے اولین تاثرات اس حصہ عقل پر جا کر جذب ہو جاتے ہیں مثلاً جب ہماری آنکھ کسی چیز کو دیکھتی ہے، تو انسانی عقل کے اس حصے پر اس کی تصویر مرتسم ہو جاتی ہے، اسی لیے اسے لوح النفس بھی کہتے ہیں۔(مشہور لغت دان سید احمد دہلوی حس مشترک کے تحت لکھتے ہیں، ''حس مشترک اس قوت کا نام ہے جو تمام صور محسوسات کو حواس خمسہ ظاہری میں منقوش اور مرتسم ہوتے ہیں، قبول کر لیتی ہے۔ پس حس مشترک کو ایک تالاب اور پانچوں حواس ظاہری کو اس میں پانی پہنچانے والی نہریں تصور کرنا چاہیے، اس کا مقام پیشانی کے جوف میں ہے)۔(فرہنگ آصفیہ:۲)

(۲)حس خیال:

حس خیال کا کام یہ ہے کہ مدرکات اور محسوسات کی جو تصاویر اور شکلیں حس مشترک میں پہنچتی ہیں، حس خیال ان کی ظاہری صورتوں کو اپنے اندر محفوظ کر لیتی ہے۔ مثلاً جب ہم لفظ ''میں'' بولتے ہیں تو اس لفظ کی ظاہری صورت یعنی ''میم''''ی'' اور ''نون غنہ'' ہے، چنانچہ اس کے ظاہر کا یہ تاثر حس مشترک پر منعکس ہوتا ہے، اور یہ تاثر بصورت تصویرِ حس خیال میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

(۳)حس واہمہ:

جس طرح محسوسات کی ظاہری شکل وصورت کو حس مشترک نے حواس ظاہری سے وصول کیا تھا' اسی طرح حس واہمہ مدرکات حسی کے معنی ومفہوم یعنی ان کی باطنی شکل وصورت کا ادراک کرتی ہے اور محفوظ رکھنے کے لیے ان تاثرات کو اس سے اگلی حس میں منتقل کر دیتی ہے' جسے حافظہ کہا جاتا ہے۔

(۴)حسِ حافظہ:

یہاں محسوسات کے مفہوم یعنی معنوی وجود کو اس طرح سے محفوظ کیا جاتا ہے' جس طرح ان کی ظاہری شکل کو حس خیال میں محفوظ کیا گیا۔

(۵)حسِ متصرفہ:

پانچویں اور آخری باطنی حس متصرفہ کہلاتی ہے' جس کا کام یہ ہے کہ حس مشترک میں آنے والی ظاہری صورت کو قوت واہمہ میں حاصل ہونے والے معنی سے اور حس خیال میں محفوظ شکل وصورت کو قوت حافظہ میں محفوظ مفہوم کے ساتھ جوڑ دیتی ہے۔اس طرح انسان مختلف الفاظ سن کر ان کا مفہوم سمجھنے' مختلف رنگ دیکھ کر ان میں تمیز کرنے اور مختلف ذائقے چکھ کر ان میں فرق کرنے پر قادر ہوتا ہے اس طرح یہ پانچوں حصے باہم مل کر ایک خاص نقطے تک پہنچتے ہیں' جسے علم کہا جاتا ہے۔ یہاں ادراک علم میں بدل جاتا ہے۔ اگر یہاں حس مشترک موجود نہ ہو تو یہ پانچوں حواس بے بس ہو کر رہ جائیں۔اس طرح اگر ان میں حس واہمہ صحیح نہ ہو' تو آپ سب کچھ دیکھیں لیکن جان کچھ نہ سکیں۔آواز تو سنائی دے گی مگر اس کا مفہوم سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ چیز کو ہاتھوں سے چھوا تو جا رہا ہوگا۔مگر نرم اور سخت چیزوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکے گا۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حواس ظاہری علم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے حواس خمسہ باطنی کے محتاج ہیں۔ جب تک حواس ظاہری کے مدرکات ان پانچوں حواس باطنی سے

گزر کر ایک صحیح نتیجے تک نہ پہنچیں' اس وقت تک حواس ظاہری کے ذریعے محسوس کیے جانے والے تمام مادی حقائق علم کی شکل اختیار نہیں کر سکتے۔ گویا حواس ظاہری کسی شے کو محسوس تو کرتے ہیں' اسے معلوم نہیں کر سکتے۔

دوسری طرف عقل اور اس کے حواس باطنی مکمل طور پر حواس ظاہری کے محتاج ہیں۔ اگر آنکھ دیکھنے سے' کان سننے سے' ناک سونگھنے سے اور زبان چکھنے سے محروم ہو تو تمام عقلی حواس مل کر بھی کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ لہذا جہاں حواس عقل کے محتاج ہیں وہاں خود عقل بھی حواس کی محتاج ہے۔

اگر کسی بچے کی پیدائش کے بعد اسکی ایسے مقام پر پرورش کی جائے جہاں کوئی آواز اس کے کان میں پڑنے نہ پائے تو ایسا بچہ پچاس سال کا ہو جانے کے باوجود نہ کچھ بول سکے گا اور نہ کچھ سمجھ سکے گا' اس کی وجہ فقط یہ ہے کہ ہم جو کچھ اپنی زبان سے بولتے ہیں یہ دراصل نتیجہ ہوتا ہے ان آوازوں کا جو کانوں نے سنیں اور جنہیں عقل نے حافظے میں محفوظ کر لیا۔ جب یہ شخص اپنے کان سے کچھ سن ہی نہیں سکا اور اس کی عقل الفاظ' حروف' لہجوں اور آوازوں کو محفوظ ہی نہ کر سکی تو جس طرح اس کا دماغ الفاظ کے معاملے میں سفید کاغذ کی طرح کورا رہا اسی طرح اس شخص کو اپنی کیفیات' حاجات اور خواہشات کے بیان پر بھی قدرت حاصل نہ ہو سکی (بنا بریں آنحضور ﷺ کے زمانہ اقدس میں اہل عرب کا یہ معمول تھا کہ وہ اپنی اولاد کو حضانت کے لیے بدوی عورتوں کے سپرد کر دیتے تھے' تاکہ وہ ان لوگوں کی خالص اور فصیح عربی سن کر بولنے پر قادر ہو سکے۔

انسان اور اس کی بساطِ علم:

اب یہ طے پا گیا کہ انسانی عقل کی پرواز صرف وہیں تک ہوتی ہے جہاں تک حواس اپنا کام کرتے ہیں۔ چنانچہ جو حقیقت آپ کی باصرہ' سامعہ' لامسہ' ذائقہ اور شامہ قوتوں کی دسترس سے باہر ہو' اس کا ادراک عقل بھی نہیں کر سکتی۔ حواس کے خام مال کے بغیر عقل ایک عضوِ معطل ہے

اور عقل کے بغیر سارے کے سارے حواس عبث و بیکار ہیں پس انسان کو جو ذرائع عطا کیے گئے ہیں وہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس لیے حواس خمسہ اور عقل کی فعالیت کے باوجود انسانی زندگی کی حقیقت سے متعلق اکثر سوالات تشنہ طلب رہتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ انسان کو کس نے پیدا کیا؟ انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ آغاز کائنات کیسے ہوا؟ اور اس کا اختتام کیسے اور کب ہوگا؟ اس کائنات سے اس کا تعلق کیا ہے؟ اس کائنات میں زندگی گزارنے کے لیے کون سے قانون کی پاسداری کی جائے؟ کون سی اچھی ہے اور کون سی بری؟ ظلم کیا ہے اور انصاف کیا؟ مرنے کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟ آیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے یا ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے؟ اگر وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے تو اس نظام زندگی کا مفہوم کیا ہوا' اور اگر مرنے کے بعد نئی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اسکی کیفیت کیا ہے؟ مزید یہ کہ مرنے کے بعد اس سے کوئی جواب طلبی بھی ہوگی یا نہیں۔

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ علی ہذا القیاس اگر انسانی زندگی بامقصد ہے تو انسان کو ان سوالات کا تسلی بخش جواب چاہیے۔ جب یہ تمام سوالات انسانی عقل پر دستک دیتے ہیں تو انسان ان کے جواب کے لیے اپنی آنکھوں کی طرف رجوع کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہیں کہ ہم تو خود تیرے باعث معرض وجود میں آئی ہیں' ہم تیری تخلیق سے پہلے کا حال کیوں کر جان سکتی ہیں۔ انسان اپنے کانوں سے پوچھتا ہے تو کان گویا ہوتے ہیں کہ ہمارا وجود خود تیری ہستی کا رہینِ منت ہے۔ جو اشیاء ہمارے دائرہ ادراک سے ماورا ہیں ہم ان کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ انسان اپنی قوت شامہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ یہ حقائق سونگھنے سے معلوم نہیں ہوتے' میں ان سوالات کا جواب کس طرح دوں۔ انسان اپنی قوت ذائقہ سے پوچھتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ ان ماورائی حقیقتوں کو چکھا نہیں جا سکتا' میں بھی مجبور ہوں۔ پھر انسان اپنی قوت لامسہ سے سوال کرتا ہے تو وہ جواب دیتی ہے کہ میں ان احوال کو چھو نہیں سکتی' ان کی نسبت کیا بتاؤں۔ الغرض انسان نے حواس خمسہ میں سے ہر ایک کے دروازے پر دستک دی'

ان میں سے ہر ایک سے پوچھا کہ بتاؤ ہمارا خالق کون ہے؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ مجھے آنے کے بعد کہاں جانا ہے؟ اچھائی اور برائی کیا ہے؟ مگر انسانی حواس انتہائی درماندگی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حقائق کوئی آواز نہیں کہ ہم سن کر بتا سکیں، کوئی رنگ نہیں کہ دیکھ کر جواب دے سکیں، مادی اجسام نہیں کہ چھو کر فیصلہ صادر کر سکیں اسطرح انسانی حواس کی بے بسی اور عاجزی پوری طرح نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور جب واضح ہو جاتا ہے کہ وہ تمام حقائق جن سے انسان کی اخلاقی و روحانی اور اعتقادی و نظریاتی زندگی تشکیل پاتی ہے، پانچوں حواس کی زد سے ماورا ہیں تب انسان اپنی عقل کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس کا دامن جھنجھوڑ کر کہتا ہے: اے میرے وجود کے لیے سرمایہ افتخار چیز! میری زندگی کے بنیادی حقائق سے متعلق مجھے تمام حواس نے مایوس کر دیا، اب تو ہی اس سلسلے میں میری راہنمائی کر! مگر عقل بھی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے اے انسان! میں تو تیرے حواس کی محتاج ہوں، جو چیز حواس کے ادراک میں نہیں آ سکتی، اس کے متعلق میں کیسے فیصلہ صادر کر سکتی ہوں۔ اگر حواس خاموش ہیں تو میں بھی بے بس و مجبور ہوں۔ رب تعالیٰ نے انسان کو ذریعہ علم کے طور پر ایک اور باطنی سرچشمہ بھی عطا کیا ہے جسے وجدان کہتے ہیں۔

وجدان اور اس کے لطائف:

انسانی وجدان کے بھی پانچ گوشے ہیں، ان کو لطائفِ خمسہ کہتے ہیں۔ لطیفہ قلب، لطیفۂ روح، لطیفۂ سر، لطیفۂ خفی، لطیفۂ اخفی۔

ان لطائف کے ذریعے انسان کے دل کی آنکھ بینا ہو جاتی ہے، حقائق سے پردے اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں، روح کے کان سننا شروع کر دیتے ہیں اور یوں انسانی قلب بعض ایسی حقیقتوں کا ادراک کرنے لگتا ہے جو حواس و عقل کی زد میں نہیں آ سکتے۔ لیکن انسانی وجدان کی پرواز بھی طبیعی کائنات (Physical World) تک محدود ہے۔ امام غزالیؒ ارشاد فرماتے ہیں:

ووراء العقل طور آخر، تنفتح فيه عين، اخرى فيبصر بها الغيب، وما سيكون فى المستقبل، واموراخر العقل معزول عنها۔

(المنقذ من الضلال:۵۴،مصطبوعہ لاہور)

اور عقل کے بعد ایک اور ذریعہ سے جس میں باطنی آنکھ کھل جاتی ہے اس کے ذریعے عینی حقائق اور مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کو دیکھا جاتا ہے اور ان دیگر امور کو بھی جن کے ادراک سے عقل قاصر ہے۔

لیکن وہ حقائق جو طبیعی کائنات کی وسعتوں سے ماوراء ہیں، جو خدا کی ذات وصفات سے متعلق ہیں اور انسانی تخلیق اور اس کے مقصد تخلیق نیز اس کی موت اور مابعد الموت سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے بارے میں حتمی اور قطعی علم نہ تو حواس دے سکتے ہیں، نہ عقل اور نہ ہی وجدان۔ انسان نے یکے بعد دیگرے تینوں ذرائع علم کے دروازوں پر دستک دی، مگر ہر ایک نے اسے مایوس کر دیا۔ کوئی بھی ذریعہ اس کے علم کو حتمیت اور قطعیت نہ دے سکا۔ اب انسان خدا کی ذات کو پکارتا ہے اور کہتا ہے کہ اے رب کائنات! میں خود اپنی ذات، اس کائنات اور تیری ذات کو یقینی طور پر سمجھنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جو مجھے مطمئن کر سکے۔ اس لیے اس کائنات میں میرے لیے علم کا کوئی ایسا سرچشمہ پیدا کر دے، جو مجھے ان حقائق کے بارے میں حقیقی آگاہی بخش سکے۔ جہاں تمام حواس ناکام ہو جائیں۔ وہاں اسے پکارا جا سکے۔ جہاں انسانی عقل خیرہ ہو جائے، وہاں اس سے مدد کی درخواست کی جا سکے۔ جہاں انسانی وجدان بھی نامراد لوٹ آئے، وہاں اس سرچشمہ علم سے فیضان کی بھیک مانگی جا سکے۔

علوم نبوت کا فیضان:

انسان جب پوری طرح اپنی علمی بے بسی اور فکری کم مائیگی کا اعتراف کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ الٰہی سے ندا آتی ہے اے انسان! تو نے اپنے علم اور اپنے ذرائع کی بے بسی کا

اعتراف کرلیا۔ہم تجھے یہی سمجھانا چاہتے تھے کہ تو کہیں اپنے حواس وعقل اور کشف ووجدان کی بدولت یہ تصور نہ کر بیٹھے کہ میرا علم درجہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ تیرا علم ابھی کائنات کی حقیقتوں کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکا (اسی لیے قرآن مجید میں روح کی حقیقت پر بحث کے دوران میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًاO اور تمہیں بہت ہی تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔

(بنی اسرائیل ۱۷:۸۵)

اب تجھے جس سرچشمہ علم کی تلاش ہے وہ ہم نے نظام نبوت ورسالت کی صورت میں اس کائنات میں قائم کردیا ہے اس سلسلہ میں نبوت ورسالت کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے ہی مکمل رہنمائی حاصل ہوسکتی ہے۔علم نبوت کے فیضان سے تمام حقیقتیں بے نقاب ہوجائیں گی۔

مقصد رسالت ونبوت:

نظام رسالت ونبوت کے ذریعے قدرت نے انسانوں کو وہ سرچشمہ علم عطا کردیا جو انہیں ان کا مقصدِ تخلیق بھی بتلاتا ہے ان کے خالق ومالک کی ذات کی نشاندہی بھی کرتا ہے اس کی صفات اور افعال کی معرفت بھی عطا کرتا ہے یہاں تک کہ مرنے کے بعد کی زندگی کی حقیقت بھی بیان کرتا ہے۔گویا وہ سب بنیادی حقائق جو چشم عالم سے مخفی تھے علوم نبوت کے طفیل آشکارا ہوگئے جن کی جستجو انسان ازل سے کرتا آیا تھا اور جن کی حتمی معرفت سے انسان کے حواس عقل اور وجدان سب ناکام ہوچکے تھے انوار رسالت نے تمام حجابات اٹھا کر انہیں تفصیل سے واضح کردیا۔لہذا اس وقت تک انسانی علم پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک سلسلہ نبوت ورسالت کے ساتھ اپنا تعلق استوار نہ کیا جائے۔

ذرائع انسانی سے حاصل شدہ علم میں غلطی کا امکان

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ حواس کے ذریعے انسان کو جو علم حاصل ہوتا ہے' اس میں بہرصورت غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ عقل غلطی کرسکتی ہے اور وجدان اور کشف میں بھی سقم ہوسکتا ہے' جبکہ انسان ایسے حتمی وقطعی علم کی جستجو اور طلب رکھتا ہے' جس میں غلطی اور خطا کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی موجود نہ ہو۔

عین ممکن ہے کہ زید کی آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے' عمرو کی آنکھ اسے غلط ثابت کردے۔ ایک شخص کی عقل ایک دلیل سے جو نتیجہ اخذ کرے' دوسرے کی سوچ اسی دلیل سے اس کے برعکس نتائج اخذ کرے۔ اسی طرح وجدان اور دیگر حواس کے فیصلوں میں بھی غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ لیکن علم کا وہ درجہ کمال اور علم کی وہ رفیع حالت' جہاں غلطی اور خطا کا کوئی امکان نہ ہو' جہاں انتشار اور افتراق کی کوئی گنجائش نہ ہو' وہ صرف اور صرف بارگاہ نبوت ورسالت کی دریوزہ گری سے حاصل ہوسکتی ہے' یا پھر ان اہل اللہ کے فیضان نظر سے جو اپنی ذات کو انوار نبوت و رسالت سے مستنیر کرچکے ہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ انسانی حواس ہوں یا انسانی عقل' یہ سارے کے سارے ذرائع انسان کو حتمی علم مہیا نہیں کرسکتے۔ حتمی علم صرف اسے حاصل ہوتا ہے' جو آفتاب نبوت کے انوار سے اپنے سینے کو منور کررہا ہو اور یہ مقام صوفیاء کو نصیب ہوتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ علوم نبوت ورسالت ہی کا علم وہ واحد ذریعہ ہیں' جن کی فراہم کردہ معلومات میں غلطی اور خطا کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا۔

سائنسی علوم واکتشافات کی حقیقت:

یہاں قدرتی طور پر ذہن سائنس اور اس کے اکتشافات کی طرف متوجہ ہوتا ہے جہاں تک سائنس اور اس کی تحقیقات کا تعلق ہے' ان کو نظریات (Theories) کا نام تو دیا جاسکتا ہے

مگران تحقیقات کو کائنات کے بنیادی حقائق کا نام نہیں دیا جاسکتا۔آج سائنسی تحقیق ایک بات ثابت کرتی ہے' کچھ عرصے کے بعد دوسری تحقیق اسے غلط ثابت کردیتی ہے' آج سائنس کسی مسئلے میں ایک موقف اختیار کرتی ہے' کچھ عرصے کے بعد سائنس دان نیا نقطہ نظر پیش کردیتے ہیں۔ سائنسی تحقیق کا آغاز (Hypothesis) سے ہوتا ہے اوراسکی تصدیق تجربے (Experiment) سے ہوتی ہے'اس کے بعد سائنس اپنے ارتقائی مراحل کے ذریعے نظریے کی منزل پر نہیں پہنچتی ہے۔اس کے باوجود ماہرین کے خیال میں سائنس کا اسی (۸۰) فی صد علم غیر یقینی (Indefinite) اور ظنی (Probable) ہے۔ یہ انسانی علوم (Social Sciences) ہوں یا قدرتی علوم (Natural Sciences)' کمیسٹری (Chemistry) اور طبعیات (Physics) ہو یا نباتات (Botany) اور حیوانیات (Biology)' ان سب علوم کی تحقیقات کا ۷۰ یا ۸۰ فیصد حصہ ابھی اقدام وخطاء (Trial & Error) کے مرحلے میں ہے' سائنس اپنی سینکڑوں برس کی جدوجہد کے باوجود وہ پیمانہ دریافت نہیں کرسکی جس پر وہ اپنی معلومات اور دریافتوں کو پرکھ کر قطعی اور حتمی شکل میں پیش کرسکے۔ بہت کم ایسی سائنسی تحقیقات ہیں جو قانون بنتی ہیں۔علم جب تک حتمیت اور قطعیت کے درجے تک نہ پہنچے' اس وقت تک وہ باکمال نہیں بن سکتا۔گویا سارے ذرائع علوم اقدام وخطا پر مبنی معلومات رکھتے ہیں' لیکن نبوت ورسالت کے تمام علوم واکتشافات ہر قسم کی خطا اور غلطی سے منزہ ہیں اور وہ شروع سے آخر تک حتمیت وقطعیت کی شان لیے ہوئے ہیں۔اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے:

وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوۡا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ۔ (محمد'۴۷:۲)	اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو کچھ حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا' اسے مانا یہی ان کے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔

رسول اور نبی جو بات اپنی زبان سے کہتا ہے وہ ابدی صداقتوں کی امین ہوتی ہے'

سورج مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوسکتا ہے' کائنات میں شب و روز کا نظام بدل سکتا ہے لیکن نبی کی زبان سے صادر ہونے والی حقیقت کبھی غلط نہیں ہوسکتی۔

نظام رسالت و نبوت انسان کو وہ علم عطا کرتا ہے جو ہر اعتبار سے حتمی اور قطعی ہوتا ہے۔ وہ اپنے آغاز ہی سے مرتبہ کمال پر فائز ہوتا ہے۔ اس علم کے تجرباتی مراحل (Experimental Verification) سے گزرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ علم بنیادی اور دائمی حقیقتوں کی بات کرتا ہے۔ انسانی عقل جوں جوں فروغ پاتی جاتی ہے' علم نبوت و رسالت کی بیان کردہ حقیقتوں کے قریب سے قریب تر ہوتی چلی جاتی ہے' بالآخر انسانی علم کی انتہا علوم نبوت کی تصدیق کرنے لگتی ہے۔

سائنس اور مذہب کی مطابقت:

سائنس آج اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ انسانی تخلیق ایک خلیے (Cell) سے ہوتی ہے' پھر وہ سیل (Cell) تقسیم ہو کر دو خلیوں میں تبدیل ہوتا ہے' پھر اس کی مزید تقسیم ہو جاتی ہے اور دو سے چار اور چار سے سولہ سیل بنتے چلے جاتے ہیں۔ ہمارا علم حیوانیات (Zoology) کئی سو سال کی تحقیق اور تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا' لیکن علوم نبوت نے بصورت قرآن آج سے چودہ سو سال پہلے ہمیں اس سے آگاہ کر دیا تھا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً۔	اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہاری پیدائش (کی ابتداء) ایک جان سے کی پھر اسی سے اس کا جوڑ پیدا فرمایا پھر ان دونوں میں سے بکثرت مردوں اور عورتوں (کی تخلیق) کو پھیلا دیا۔
(النساء ۴:۱)	

گویا پہلی تقسیم نے ایک جان کو دو جانوں (Cell) میں تبدیل کیا۔ پھر ان دو جانوں سے ہزاروں لاکھوں جانوں کا سلسلہ پھیلا دیا گیا۔ جو حقیقت آج سے چودہ سو برس پہلے بیان

کردی تھی، سائنس سینکڑوں سال کے تجربات کے بعد اس نتیجے پر پہنچ پائی ہے۔ کیونکہ علوم نبوت مبنی بروحی ہوتے ہیں اس لئے اس کلام میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح ایک جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ (الانبیاء۲۱:۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائی ہیں۔

یہ حقیقت بھی سائنس کی ہزار سالہ کوششوں اور تجربات کے نتیجے میں دریافت کی گئی کہ آغاز پانی سے ہوا ہے (سائنسی اصول ہے: (Water was held to be the first principal of all things) ''تمام اشیا کے بننے کی پہلی اکائی پانی ہے۔'' اسی طرح عقل انسانی اور فلسفہ عرصہ دراز سے سورج کو غیر متحرک قرار دیتے رہے، جبکہ قرآن اسے ۱۴ سو سال پہلے سے متحرک قرار دے چکا ہے۔ اب سائنس نے بھی اپنی تحقیقات کے نتیجے میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ سورج متحرک ہے اور باقاعدہ ایک نظام کے تحت گردش کر رہا ہے۔ یہ حقیقت قرآن کریم نے بہت پہلے بیان کر دی تھی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ سے ظاہر ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذَالِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمِ O (یٰسٓ ۳۶:۳۸) اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا ہے۔ یہ خدائے غالب ودانا کی مقرر کی ہوئی تقدیر ہے O

سرور کائنات ﷺ کی زبان مبارکہ سے یہ دعویٰ اس وقت ہوا جب ساری دنیا کے فلسفی سورج کو غیر متحرک (ساکن) مان رہے تھے، لیکن سینکڑوں برسوں کے بعد عقل انسانی کو وہی نظریہ اختیار کرنا پڑا جو ایک امی نبی کی زبان سے صادر ہوا تھا۔

خلاصہ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسانی علوم جب تک بارگاہ رسالت ونبوت میں سربسجود نہ ہوں اس

وقت تک ان کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جن حواس ،جس عقل اور جس وجدان پر اعتماد کرتا ہے ان کی پرواز محدود ہے یہ سب ایک نکتے پر پہنچ کر رک جاتے ہیں۔ان کے لیے اس سے آگے تاریکی ہی تاریکی ہے۔لہذا انسانی علوم کی تکمیل کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ علومِ رسالت کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دیں۔

مسلمان سائنسدانوں کے لیے لمحہ فکریہ:

چنانچہ مسلمان دانشوروں کی تحقیقات لادینی نظریات اور غیر اسلامی طبیعی و حیاتیاتی تصورات کی کرید پر نہیں بلکہ قرآنی تصورات کے رخ پر ہونی چاہیں۔مسلمان مفکرین اور سائنسدانوں کے لیے یہ ایک لمحہ فکریہ ہے۔کاش کچھ ایسے مسلمان سائنسدان پیدا ہوجائیں جو عالم طبیعی سے متعلق قرآنی حقائق کو بنیاد بنا کر اس پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھیں اور یوں عالم انسانیت کے لیے وہ بے بہا جواہر تحقیق سامنے لائیں جن کی نشان دہی قرآن میں جابجا کردی گئی ہے۔

(۴) انسانی عمل کی تکمیل اور ضرورتِ رسالت:

حواس اور دیگر قوائے انسانی حقائق و معارف کائنات کے ادراک میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔حواس کی ناکامی کے اس اعتراف کے بعد اللہ رب العزت کی طرف سے انسان کو علوم و معارف نبوت کے فیضان سے مشرف کیا جاتا ہے اور علوم وحی کے ذریعے انسان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔اس لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی عمل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ نظام نبوت و رسالت کے ساتھ اپنا تعلق قائم کیا جائے اور اس کی رہنمائی حاصل کی جائے۔

علوم نبوت عطا کیے جانے کی غرض و غایت:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو علم وحی و نبوت آخر کس لیے دیا جاتا ہے؟ کیا محض اس لیے کہ وہ انسانی دنیا میں ایک نیا نظریہ اور فلسفہ بن کر رہ جائے؟ یا محض اس لیے کہ تفنن طبع کے

طور پر گا ہے بگا ہے اس کا مطالعہ کرلیا جائے؟ حقیقت یہ ہے کہ خداوند قدوس کو ہرگز ہرگز ایسا مطلوب نہیں' کیونکہ جب تک علم ترقی کر کے عمل کی صورت میں متشکل نہ ہو جائے' اس وقت تک علم کی افادیت غیر محسوس اور نا معلوم رہتی ہے۔ مثال کے طور پر انسانوں کو اس بات کا علم کہ پانی پیاس بجھاتا ہے۔ کیا محض اس کلیے سے آگاہی کسی تشنہ لب کے لیے تشفی کا ذریعہ بن سکتی ہے؟ ہمارے روزمرہ مشاہدے کا جواب نفی میں ہے' کیونکہ جب تک اس علم کے مطابق عمل اختیار نہ کیا جائے یعنی کہیں سے پانی لے کر نہ پی لیا جائے' اس وقت تک پیاس کا بجھانا ممکنات میں سے ہے یہی حال وحی اور نبوت کے علوم کا ہے۔

اسی بنا پر وحی الٰہی پر مبنی علم سے استفادے کے لیے نمونہ عمل کی ضرورت ہوتی ہے' چنانچہ علم حقیقی کا یہ خارجی وجود نظام رسالت کی رہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔

چنانچہ ارشاد خداوندی ہے کہ ہم نے جس رسول کو بھی اس دنیا میں مبعوث کیا ہے اس کی بعثت کی غرض وغایت ہی یہ تھی کہ دنیائے انسانیت اس کی سیرت وکردار کی صورت میں احکام الٰہی کی پاسداری کا نظارہ کرے اور اس کی روشنی میں اپنے عمل کی راہیں متعین کرے' چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء' ۴:۵۰۱)	اور ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجا' اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم سے اس کی پیروی کی جائے۔

یعنی اس کے طرز عمل اور کردار کو دیکھ کر دوسرے انسان بھی اپنے اعمال کی اصلاح کرسکیں۔ اسی بنا پر قرآن کی رو سے محض ''حصول علم'' پر مدار نجات نہیں' بلکہ وہ اس مقصد کے لیے عمل اور جدوجہد کو لازمی قرار دیتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔	اور فرما دیجیے تم عمل کرو' سو عنقریب عمل کو اللہ (بھی) دیکھ لے گا اور اس کا

(التوبۃ۹:۱۰۵) رسول (بھی) اور اہل ایمان (بھی)

اس آیت مبارکہ کے ذریعے یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خدا تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول ﷺ اور جملہ مومنین کی نظر تمہارے علم کو عمل میں ڈھلا ہوا دیکھنا چاہتی ہے اور یہی مدار نجات ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَبِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔

(النساء۴:۱۲۳)

(اللہ کا وعدہ مغفرت) نہ تمہاری خواہشات پر موقوف اور نہ اہل کتاب کی خواہشات پر جو کوئی برا عمل کرے اسے اسکی سزا دی جائے گی اور نہ وہ اللہ کے سوا اپنا کوئی اپنا کوئی حمایتی پائے گا اور نہ مددگار۔

بعثتِ انبیاء کی غرض وغایت:

اگر اس کائنات میں انبیاء ورسل کو مبعوث نہ کیا جاتا اور اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور صحیفوں کے ذریعے بنی نوع انسان تک ہدایت کا پیغام پہنچا دیتا تو ان تعلیمات کے بنی نوع انسان تک پہنچنے کے باوجود منشاء ہدایت ہرگز پورا نہ ہوتا' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ تھا کہ ایسی ہستیاں دنیا میں بھیجی جائیں جو اس کی رضا اور ہدایت کا پیکر بن کر خود کو دنیا کے سامنے پیش کریں' اسی لیے آفرینش آدم کے موقع پر ارواح انسانی کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا گیا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O

(البقرۃ۲:۳۸)

پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی پیروی کرے گا' نہ ان پر کوئی خوف (طاری) ہوگا اور نہ وہ غمگین

ہوں گے۔

گویا شروع ہی میں یہ امر واضح کیا گیا تھا کہ محض علم ہدایات کا پالینا کافی نہیں بلکہ اس پیغام ہدایت کی زندگی کو عملاً اپنانے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس موقع پر خوف اور غم سے محفوظ رہنے کی جو بشارت دی گئی، وہ محض ہدایت کے علم کی بناء پر نہ تھی بلکہ خدائی ہدایت کی پیروی کی بناء پر دی گئی تھی۔

یہاں جو لفظ استعمال کیا گیا ہے فمن تبع۔ تبع کا لفظ اتباع (تبعہ واتبعہ) کے معنی بقول امام راغب الاصفہانی ''کسی کے نقش قدم پر چلنے کے ہیں''۔ یہ کبھی اطاعت وفرمانبرداری سے ہوتا ہے جیسے کہ محولہ بالا آیت مبارکہ میں ہے اور کبھی کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا ہے۔ جیسے کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاَتۡبَعُوۡهُمۡ مُّشۡرِقِيۡنَ O — پھر سورج نکلتے وقت ان (فرعونیوں) نے انکا تعاقب کیا۔ (الشعرا، ۲۶:۶۰)

سے بنا ہے، اس آیت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے اتباع اور اطاعت کے مفہوم میں بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اطاعت اور اتباع کے الفاظ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اطاعت واتباع میں امتیاز:

ارشاد خداوندی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۔ — اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے (اہل حق) صاحبان امر کی۔ (النساء، ۴:۵۹)

نیز فرمایا:

وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَO (الانفال۸:۱) اور اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہوo

اسی طرح بے شمار مواقع پر لفظ اطاعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ جب کہ اتباع کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں بلکہ زیادہ تر ذات رسالت مآب ﷺ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ۔ (آل عمران۳:۳۱) (اے حبیب!) آپ فرما دیں اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا اور تمہارے لئے تمہارے گناہ معاف فرما دے گا۔

اس طرح اتباع کا لفظ رسالت مآب ﷺ کی پیروی کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے جب کہ لفظ اطاعت اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ دونوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

لفظ ''اتباع کے مفہوم میں مغالطہ:

عوام کے ذہنوں میں یہ اشکال ابھرتا ہے کہ عموماً اطاعت و اتباع کا ترجمہ ایک ہی ''پیروی کرنا'' کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دونوں کے مفہوم میں فرق ہے تو مترجمین اس فرق کو کیوں ملحوظ نہیں رکھتے؟

اصل بات یہ ہے کہ اردو زبان کا دائرہ عربی کے مقابلے میں اتنا وسیع نہیں ہے، جو اتنے باریک اور لطیف فرق کو ایک لفظ سے متمیز کر سکے ورنہ دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ اطاعت حکم کی بھی ہوتی ہے اور عمل کی بھی۔ جب کہ صحیح اتباع اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حکم نمونے کے

سانچے میں ڈھل کر سامنے نہ آجائے (اتباع کا مادہ تبع ہے جس سے لفظ تابع وجود میں آیا ہے جس کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں' خواہ اچھائی میں ہو یا برائی میں۔ خیر کا مرکز سرور کائنات ﷺ کی ذات اقدس ہے آپ کی پیروی خیر کی پیروی ہے۔ جبکہ شر کا منبع شیطان ہے جس کی پیروی شر کی پیروی اور ضدِ ایمان ہے) ارشاد خداوندی ہے:

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ O (سبا' ۳۴:۲۰)

اور (ان ناشکر گزار) لوگوں کے بارے میں شیطان نے اپنا خیال سچ کر دکھایا کہ مومنوں کی ایک جماعت کے علاوہ سب اسکے پیچھے چل پڑے O

صرف اتباع رسول ﷺ ہی کیوں؟

جہاں تک اللہ رب العزت کا تعلق ہے تو بلاشبہ اس کی اطاعت سب انسانوں کا اولین فرض ہے' مگر اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولوں کی ذوات مقدسہ میں فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ احکام صادر فرماتا ہے۔ مثلاً یہ حکم دیتا ہے کہ:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۔ (البقرہ' ۲:۴۳)

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو۔

لیکن وہ ذات خود اس امر سے بالاتر ہے کہ انسانی شکل وصورت اختیار کر کے نماز ادا کرے اور لوگوں کو دکھائے کہ یوں قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ:

فَانْكِحُوْا مَاطَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ۔ (النساء' ۴:۳)

ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے پسندیدہ اور حلال ہوں۔

لیکن اللہ تعالیٰ خود نکاح کر کے ازدواجی زندگی بسر کرنے سے مبرا اور منزہ ہے۔ جس کی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی ذات سے محض حکم صادر ہوتا ہے۔ اس کی ذات حکم کی عملی

مثال یا نمونہ پیش کرنے سے ماوراء ہے۔اس لیے اس کی اطاعت تو ہوسکتی ہے لیکن اتباع نہیں۔ جب تک حکم کسی پیکر مثال میں ڈھل کر آنکھوں کے سامنے نہ آجائے اور علم عمل کے ڈھانچے میں تبدیل ہوکر انسانوں کو دکھائی نہ دینے لگے اس وقت تک اس کی اتباع ممکن نہیں۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ احکام تو خود دیئے مگر ان کی عملی مثال پیش کرنے کے لیے انبیاء ورسل کو مبعوث فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح فرمادیا کہ جو کوئی ان کی اتباع کرے گا وہ حقیقت میں خدا ہی کی اطاعت ہوگی۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا۔

جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ (ہی) کا حکم مانا اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔

(النساء ۴:۸۰)

حضور نبی کریم ﷺ کی فرمانبرداری اور اطاعت ہی اللہ تعالی کی اطاعت ہے۔ آپ ﷺ کی رضا اور ناراضگی میں ہی اللہ تعالی کی رضا اور ناراضگی ہے۔اگر کوئی انسان حضور نبی کریم ﷺ کی اطاعت میں اپنی زندگی بسر کرتا ہے تو اس نے درحقیقت اللہ تعالی کی رضا اور خوشنودی میں ہی اپنی زندگی بسر کی۔مسلمان کی ایمان کی بنیاد اور پہچان بھی آپ ﷺ کی فرمانبرداری سے حاصل ہوتی ہے۔جیسا کہ حضور سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لایومن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به ۔

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتا، جب تک اس کی خواہشات ان تعلیمات کے تابع نہ ہوجائیں جو میں لے کر آیا ہوں۔

(شرح السنۃ ۱:۲۱۳، رقم:۱۰۴)

گویا جب تک انسان اپنی خواہشات، اپنی آرزوؤں اور امنگوں کو نبی مکرم ﷺ کے قدموں پر قربان نہ کردے اس وقت تک اس کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید میں یہ امر واضح کر دیا گیا ہے کہ سرور کائناتﷺ کی اطاعت ہی میں خدا تعالیٰ کی اطاعت مضمر ہے اور یہ بھی کہ آپ کو لوگوں پر داروغہ مقرر نہیں کیا گیا۔ یہی وہ بلند و بالا مقام ہے جہاں سے آپ نے علم کو عمل کے سانچے میں ڈھال کر اس کا نمونہ اس طرح بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا کہ کسی کو انکار کی مجال ہی نہ رہی۔ (یہاں اس روایت کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا اور جو راز دار نبوت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضورﷺ کے بارے میں اصحاب سیر نے نقل کی ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا گیا کہ نبی کریمﷺ کا اخلاق کیا تھا۔ فرمایا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے:

كان خلقه القرآن ۔ آپ کا اخلاق سراسر قرآن تھا۔

۱۔ مسند احمد بن حنبل، ۶:۹۱، ۲۱۶

۲۔ اسنن الکبریٰ لبیہقی، ۲:۴۹۹

۳۔ کنز العمال، ۷:۱۳۷، رقم: ۱۸۳۷۸

۴۔ صحیح للمسلم، ۱:۴۶۷، کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا باب جامع صلاۃ اللیل، رقم: ۷۴۶

گویا آپ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ جو قرآن مصحف کی صورت میں ہے وہ علمی قرآن ہے، جبکہ رسول اکرمﷺ کی ذات گرامی عملی قرآن ہے۔ قرآن میں جو حکم ہوگا، اس کی عملی تفسیر سرور کائناتﷺ کی سنت میں پائی جائے گی۔ اسی بنا پر حدیث اور سنت کو قرآن کی شرح قرار دیا گیا ہے۔ خود آپ نے مرض الوفات سے قبل ارشاد فرمایا:

تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما مسكتم بهماء كتاب الله و سنة فييه۔

(الموطا، ۱:۸۹۹، کتاب القدر، باب النبی عن قول القدر)

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت اگر تم ان کو پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔

اگر کوئی شخص آپ کی غلامی سے گریزاں ہوتو دنیوی نقصان اور خسارے کے علاوہ جہنم دہکتی ہوئی آگ کو اس مقام پر قرار دیا گیا ہے۔

حکم اور اس کا مفہوم

حکم کے لغوی معنی بقول امام راغب اصفہانی ''المنع للاصلاح''، کسی چیز کی اصلاح کے لیے اسے روک دینے کے ہیں۔ (اسی بنا پر لگام کو ''حکمۃ الدابۃ'' کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتی ہے۔ اس سے لفظ ''الحکم'' وجود میں آیا ہے جس کے معنی کسی چیز سے متعلق فیصلہ کرنے کے ہیں خواہ اس فیصلے کو لازم ٹھہرایا جائے یا لازم نہ ٹھہرایا جائے

(مفردات، ص ۲۳۷)

بنابریں حکم کا یہ مفہوم ہوا کہ انسان کو اس کی اصلاح کے لیے کسی برے کام سے روک دیا جائے۔ اسی طرح لفظ حکم کے مفہوم میں شریعت اسلامیہ کا پورا فلسفہ اور اس کی پوری فکر سمٹ آتی ہے گویا ہر بڑے کام سے بغرض اصلاح روک دینا حکم کی تعریف میں شامل ہے۔

پس یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ شریعت میں وہی چیز منع اور حرام ہے جس سے حکما روکا گیا اور منع کیا گیا ہو۔ جس چیز سے روکا نہ گیا ہو، اسے ممنوع تصور نہیں کیا جا سکتا۔ شریعت اسلامیہ کا یہی وہ آسان پہلو ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ فطرت انسانیہ کے عین مطابق ہے اسی بنا پر سرور کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا:

بعثت بالحنفیۃ السمحۃ۔ میں آسان ترین دین لے کر مبعوث کیا گیا ہوں۔

(۱۔ مسند احمد بن حنبل، ۵: ۲۶۶)

اسی بنا پر اس شریعت میں ہر وہ چیز ہے جس سے شریعت نے منع نہیں کیا اور فقط وہی امور ناجائز اور حرام ہیں، جن سے خدا اور رسول ﷺ نے منع کیا ہے، اس لیے شریعت تمام جائز امور کی فہرست مرتب نہیں کرتی کیونکہ ایسے امور بے شمار ہیں۔ البتہ ناجائز امور کو بیان کر دیا گیا

ہے۔لہذا جس چیز کے بارے میں شریعت خاموشی اختیار کر لیتی ہے' وہ چیز مباح اور جائز تصور کی جاتی ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز سے متعلق صراحت کے ساتھ منع کا حکم نہیں ہوتا مگر اس جیسی کسی دوسری چیز سے منع کیا گیا ہوتا ہے۔اس صورت میں اس کی حکم کی علت کو دلیل ٹھہرا کر' دوسری چیز کو بھی حرام تصور کیا جاتا ہے' مثلاً قرآن میں شراب کے متعلق حکم ممانعت آیا ہے مگر چرس' افیون وغیرہ کے متعلق کچھ مذکور نہیں تو جہاں حدیث نبوی کے مطابق علتِ حکم یعنی نشے کو سبب قرار دے کر ان سب کو حرام قرار دیا۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ سرور کائنات ﷺ حکم کے ایجابی اور منفی دونوں پہلوؤں میں دنیا کے سامنے ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں' کیونکہ آپ ﷺ نے نہ صرف اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کر کے دکھایا' بلکہ ان امور سے اجتناب کی مثال بھی قائم کی' جن سے شریعت نے منع کیا تھا۔اور یوں آپ ﷺ نے دشمنوں کا وہ اعتراض باطل کر دیا (جو وہ اس زمانے میں شریعت کے منفی اور مثبت احکام پر کرتے تھے۔مثلاً یہ کہ شراب کے بغیر کوئی کیونکر زندہ رہ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔آپ نے سب سے پہلے امور ممنوعہ سے خود اجتناب کیا اور پھر اسی اجتناب کی دوسروں کو دعوت دی۔صاف ظاہر ہے کہ تبلیغ اسی صورت میں موثر ہو سکتی تھی کہ دعوت دینے والا پہلے ہر حکم پر خود عمل کرے۔اسی بناء پر اصول فقہ میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ:

الاصل فی الاشیاء الاباحۃ۔ اشیاء میں اصل چیز اباحت یعنی اجازت ہے۔

بہر حال حکم کا لغوی مفہوم تو بغرض اصلاح کسی کام سے رک جانا ہے' مگر اس کے عرفی اور اصطلاحی معنی میں امر و نہی دونوں شامل ہیں۔

ایک لطیف علمی نکتہ:

اب جس امر کی وضاحت مطلوب ہے' وہ یہ ہے کہ شریعت جس کام سے لوگوں کو روکنا

چاہتی ہے' یہ ضروری نہیں کہ اس کام کا باقاعدہ ارتکاب ہو اور پھر اس سے روکا جائے' مثلاً اگر شراب سے منع کرنا مقصود ہو تو یہ لازمی نہیں کہ کوئی خود شراب پی کر دکھائے اور پھر اس سے منع کرے۔ جھوٹ سے منع کرنا مطلوب ہو تو ضروری نہیں کہ پہلے انسان جھوٹ بول کر دکھائے پھر منع کرے۔ وجہ یہ ہے کہ جو چیز بری ہے اس کے متعلق رک جانے کا حکم دے دینا ہی کافی ہوسکتا ہے۔ البتہ نمونہ عمل کی ضرورت زندگی کے ان معاملات میں پیش آتی ہے جہاں کسی کو کوئی کام کرنے کا حکم دیا جارہا ہو۔ مثلاً حکم ہے کہ نماز ادا کرو جب انسانوں کو یہ حکم دیا گیا تو اس وقت انہیں کیا خبر تھی کہ نماز ادا کرنے کا صحیح طریق کیا ہے۔ انہوں نے تو کعبہ کے گرد ناچنے اور سیٹیاں بجانے ہی کا تصور کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس لوگ شراب پیتے تھے اور جب اس سے اجتناب کا حکم آیا تو لوگوں نے اس کو پینا ترک کر دیا۔ اسی طرح شرک کیا جاتا تھا' حکم آیا کہ خدا کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو' تو لوگوں نے غیر اللہ کی عبادت ترک کر دی۔ گویا محض منع اور نہی کے معاملے میں تو حکم ہی سے عمل ہوسکتا تھا مگر امر کے معاملے میں حکم اس وقت تک اطاعت کا کام نہیں کرسکتا تھا جب تک حکم فی الواقع عمل کے محسوس قالب میں ڈھل کر سامنے نہ آجائے۔ نماز ہی کے حکم کو لیجیے۔ یہ حکم تو قرآن میں جابجا ملے گا کہ نماز قائم کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ لیکن قرآن مجید کو ''الحمد'' سے ''والناس'' تک پورا پڑھ جایئے' مقررہ افعال اور ارکان پر مشتمل مخصوص طرز کی نماز کا بیان قرآن کریم کی چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات میں سے کسی ایک آیت میں بھی نہیں ملے گا۔ اسی طرح قرآن مجید میں اوقات صلوٰۃ کے متعلق یہ حکم تو ملتا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ	بے شک نماز مومنوں پر مقررہ وقت کے
کِتَابًا مَّوْقُوْتًاO (النساء ۴:۱۰۳)	حساب سے فرض ہےo

مگر یہ کہ فلاں نماز کا وقت کب شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے۔ اس کا اشارہ کسی مقام پر بھی نہیں مل سکتا۔

سب سے اہم مسئلہ نماز کی رکعات کی تعداد کا ہے۔ قرآن کریم میں کسی جگہ نمازوں کا

رکعات کی تعین نہیں ملتا۔قرآن حکیم میں جب نماز کا حکم نازل ہوا تو صحابہ کرامؓ پریشان ہوئے اور پوچھا:

یارسول اللہ ﷺ! ہم نماز کیسے پڑھیں؟

صحابہ کرامؓ کا یہ سوال اپنی درست تھا' کیونکہ لغت میں صلوٰۃ کے معنی دعاء گوشت بھوننے' پیٹھ پر مارنے' آگ جلاے اور مطلق پیٹھ وغیرہ کے بھی ہیں۔اس کے علاوہ لغت دانوں نے صلوٰۃ کے چھپن کے قریب لغوی معانی بیان کیے ہیں۔اب سوال یہ تھا کہ قرآن مجید ان میں سے صلوٰۃ کا کون سا مفہوم مراد لیتا ہے۔جب تک عملاً اس خاص طریقے سے نماز پڑھ کر نہ دکھائی جائے جو مطلوب باری تعالیٰ تھا' اس وقت محض لغت اور زبان کے سہارے کوئی شخص نہیں جان سکتا تھا کہ صلوٰۃ کا لفظ کسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔لغت کی کسی کتاب میں اصلاً لفظ ''صلوٰۃ'' کا وہ مفہوم نہیں ملتا جو شارع علیہ السلام نے امت کو سکھایا۔

صلوٰۃ بمعنی دعا:

صلوٰۃ کا ایک معنی دعا بھی آتا ہے اور اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔	اور ان کے حق میں دعا فرمائیں بے شک آپ کی دعا ان کے لئے (باعث) تسکین ہے۔

(التوبہ' ۹:۱۰۳)

اس تمام بحث سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اگر وحی ربانی محض علم تک محدود رہتی اور انسانی شکل میں عمل کا روپ نہ دھارتی تو اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر بھی عمل کرنا ممکن نہ تھا۔جیسا کہ صلوٰۃ (نماز) جیسے دین کے اہم اور بنیادی رکن کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ بغیر نمونہ عمل کے اس کی ادائیگی ممکن نہ تھی۔پس صلوٰۃ کی ماہیت اور کیفیت کے بارے میں صحابہ کرامؓ جب

مضطرب ہوئے تو ﷺ نے ارشاد فرمایا:

صلوا کما رائیمونی اصلی۔ (صحیح البخاری، ۲: ۸۸۸، کتاب الادب، باب رحمۃ الناس والبھائم، رقم: ۵۶۶۲)

جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا دیکھتے ہو، ویسے ہی نماز پڑھو۔

چنانچہ حضور ﷺ نے عملی طور پر صحابہ کرامؓ کو نماز کے تمام ارکان ادا کر کے سمجھایا اور اس میں پڑھی جانے والی ایک ایک دعا اور ایک ایک ادا کی تعلیم دی، تب کہیں جا کر امت کو صحیح طور پر نماز کا مفہوم سمجھ میں آ سکا۔

زمانہ جاہلیت کی نماز:

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ آپکے زمانہ اقدس سے پہلے جو نماز ادا کی جاتی تھی، قرآن کریم اس کی منظریوں کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَالْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً۔ (الانفال، ۸: ۳۵)

اور اللہ کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج فرض ہے جو بھی اس تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے علم صلوٰۃ کو عمل صلوٰۃ کی صورت میں پیش کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اگر علم کو مثالی نمونے میں بدلنے والا کوئی نہ ہو تو اس پر ٹھیک ٹھیک عمل کرنا بھلا کس طرح ممکن ہے۔

بہر حال رسالت کی ضرورت انسانیت کو اس بنا پر پیش آتی ہے کہ رسول منشائے خداوندی کو عمل کی صورت میں بیان کر کے لوگوں کے لیے قلبی و ذہنی تشفی کا سامان کرے۔

حج کا حکم اور طریق رسالت:

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا۔ (آل عمران ۳:۹۷)

اور لوگوں پر خدا کا حق (فرض) ہے کہ جو اس کے گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے۔

خداوند تعالیٰ کا یہ حکم تو سب کے سامنے تھا کہ حج کرو مگر کسی کو کیا خبر تھی کہ حج کے جملہ مناسک کیا ہیں؟ حج کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ حضور ﷺ نے امت کو ان لفظوں میں مناسک حج کی تعلیم دی۔

خذوا عنی مناسکم۔ (السنن الکبریٰ للبیہقی ۵:۱۲۵)

مجھ سے حج کے مناسک سیکھو

مقصد یہ کہ میرے انداز و اطوار اور میری سنت کو دیکھ کر حج ادا کرنے کے طریقے کی تعلیم حاصل کرو۔ دیکھو کہ میں کعبۃ اللہ کا طواف کیسے کرتا ہوں۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کیسے کرتا ہوں، میدان عرفات میں کہاں کھڑا ہوتا ہوں اور حج کا یہ مقدس و متبرک دن کس حالت میں بسر کرتا ہوں۔ مزدلفہ اور منیٰ میں کیسے آتا ہوں، کنکریاں کیسے مارتا ہوں اور پھر قربانی ادا کرے احرام حج سے حلت کیسے اختیار کرتا ہوں۔

یہ تمام باتیں کسی لغت کی کتاب کے مطالعے سے دستیاب نہیں ہوسکتی تھیں، یہ امور زمانہ جاہلیت کی تاریخ اور احوال سے استنباط نہیں کیے جاسکتے تھے۔ بلکہ ان کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا نبی اور رسول آتا اور ان تمام مسائل میں بنی نوع انسان کی اس طریقے کی طرف رہنمائی کرتا، جو ذات پروردگار کو مقصود اور مطلوب تھا۔ الغرض علم کو عمل کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے نظام رسالت کی ضرورت تھی، جو پوری کر دی گئی۔

نماز کی رکعتیں بھول جانے کا واقعہ:

حضور نبی کریم ﷺ ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ آپ نے دو رکعتوں کے بعد

سلام پھیر دیا۔ صحابہؓ کو بڑا تعجب ہوا جماعت میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابہ بھی موجود تھے، مگر دربار نبوت میں لب کھولنے کی کسی کو جرات نہ تھی، اس پر ایک صحابی ذوالیدینؓ (بڑے بڑے ہاتھوں والے) آگے بڑھے اور پوچھا:

یارسول اللہ اقصرت الصلوۃ ام نسیت؟ کیا نماز چھوٹی کردی گئی ہے یا پھر آپ بھول گئے۔

(صحیح لمسلم، ۱:۲۱۳، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ، باب السہو فی الصلاۃ والسجود لہ، رقم:۵۷۳)

اس پر آپ ﷺ نے دوسرے صحابہؓ کی طرف دیکھا۔ سب نے ذوالیدین کی تائید کی، چنانچہ آپ ﷺ نے کھڑے ہوکر مزید دو رکعت نماز ادا فرمائی اور اس کے بعد سلام پھیر کر سجدہ سہو ادا کیا۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ اگر لوگوں سے کسی وقت بھول ہوجائے تو اس کی تلافی کی وہ صورت بھی ان کے سامنے موجود ہو، جو حضور ﷺ نے اختیار فرمائی۔

نماز میں بھول جانے کا مسئلہ:

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ کوئی شخص چار رکعتوں پر مشتمل نماز میں بھول جائے اور دو رکعت پر سلام پھیر دے۔ اگر اس نے کسی سے گفتگو نہ کی ہو اور قبلہ سے کلیۃً رخ نہ پھیرا ہو تو وہ شخص اپنی بقیہ نماز مکمل کر کے بعد ازاں سجدہ سہو کر لے تو نماز ادا ہو جاتی ہے اور اگر اس نے سلام پھیر کر کسی سے بات چیت کر لی یا قبلے کی طرف سے رخ پھیر لیا تو اب اسے چار ہی رکعتیں مکمل کرنا ہوں گی۔ یہ مسئلہ تو عوام کے لئے ہے لیکن حضور اقدس ﷺ اس سے کلیتاً سے مستثنیٰ ہیں۔ چنانچہ آپ نے بات چیت کرنے کے باوجود اسی نماز کو مکمل فرمایا اور بعد ازاں سجدہ سہو کر لیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ نماز اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے گفتگو کرنے کا نام ہے' قیام' رکوع اور سجود میں نمازی خدا تعالیٰ سے ہمکلام ہوتا ہے اور تشہد میں ذات رسالت مآب ﷺ کی جانب متوجہ ہو کر عرض کرتا ہے:

السلام علیک أیها النبی و رحمة اللّٰه و برکاته

اس لئے اگر کوئی شخص رسول ﷺ سے یا' رسول پاک ﷺ کسی اور سے ہمکلام بھی ہو جاتے تو اس سے نماز کی حیثیت میں فرق نہیں پڑتا تھا بلکہ وہ نماز بدستور برقرار رہتی تھی۔

نماز میں حضور ﷺ کے بلانے کا مسئلہ:

اسی بنا پر یہ حکم تھا کہ اگر صحابہؓ نماز پڑھ رہے ہوتے اور سرور کائنات ﷺ انہیں آواز دیتے' مگر صحابی نماز چھوڑ کر حضور کی بات نہ سنتے تو حضور ﷺ فرماتے: تم نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں سنا' وہ حکم یہ تھا کہ اگر حضور کسی کو بھی آواز دیں تو اسی وقت نماز چھوڑ کر حضور ﷺ کی بات سنی جائے۔ جس کام کا حضور حکم دیں وہ بتمام وکمال کر کے واپس آ کر اسی نماز کو مکمل کر لیا جائے۔ کیونکہ حضور کی ذات یا آپ کے حکم کی طرف راغب اور متوجہ رہنا نماز کا نقص نہ تھا بلکہ خود کمال نماز تھا۔ بنا بریں ایک صحابی نماز باجماعت میں بھی وفور محبت سے ہمیشہ حضور کا چہرہ انور تکتے رہتے تھے اور کسی نے

کبھی انہیں منع نہیں کیا۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جب تک کوئی نبی مبعوث ہو کر انسانیت کی عملی رہنمائی نہ کرے اس وقت تک وحی الٰہی کے منشا کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (مومنو!) بے شک تمہارے لئے رسول اللہ (کی زندگی) میں بہترین نمونہ ہے۔

(الاحزاب ۳۳:۲۱)

یہی حال روزہ، زکوۃ وصدقات، جہاد اور دیگر عبادات اور دینی معتقدات کا ہے، مگر اسلام تو دین اور دنیا دونوں کا جامع ہے۔ اسی وجہ سے آپ نے دینی مسائل بھی عمل سے واضح کئے اور دنیوی معاملات بھی خوش اسلوبی سے نباہ کر دکھائے۔

سنت مصطفویؐ کی صورت میں منشأ ایزدی کی تکمیل کی عملی مثالیں

ا۔ حضور اکرم ﷺ کی ازدواجی زندگی

قرآنی حکم تھا کہ اپنی ازواج میں عدل اور برابری کرو۔ اب سوال یہ تھا کہ اس امر عدل کا صحیح معیار اور نمونہ کیا ہوگا، جو اس حکم عدل کو عمل کے سانچے میں ڈھالے اور مثال قائم کر کے دکھاوے۔ چنانچہ سرور کائنات ﷺ خود اس سلسلے کی بہترین مثال بنے اور اپنی ازواجِ مطہرات میں اس حد تک عدل کیا کہ خود ازواج مطہرات نے برملا کہا:

ان النبی ﷺ اذا اراد سفرا اقرع بین ازواجه۔ نبی کریم ﷺ جب سفر کا ارادہ فرماتے تو اپنی ازواج کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ ڈالتے۔

(صحیح البخاری، ۲:۵۹۴، کتاب المغازی، باب حدیث الافک، رقم: ۳۹۱۰)

اور جس کا قرعہ نکلتا اسی کو ساتھ لے جاتے۔ صرف یہی نہیں بلکہ حضور سرور کائنات

ﷺ نے اپنی ازدواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ ازواج میں اس طرح برابری کی بنیاد پر تقسیم کر رکھا تھا کہ کسی زوجہ مطہرہ کو بھی اس میں شکایت کا کوئی موقع نہ تھا۔ جیسا کہ حدیث مبارکہ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

كان رسول الله يقسم بين ازواجه فيعدل۔	رسول اللہ اپنی ازواج میں وقت کو عدل و انصاف سے تقسیم فرماتے تھے۔

ا۔سنن ابوداؤد،۲:۱۳۶۷، کتاب النکاح، باب فی القسم بین النساء۔

گویا عدل بین الازواج کا حکم اسی وقت انسانیت کے لئے قابل اتباع ہوسکتا ہے، جب کوئی پیکر عدل انسانیت کے سامنے عملی مثال کے طور پر موجود ہو۔

۲۔مخلوق پر رحم کرنے کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل:

اسی طرح خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ مخلوق خدا پر رحم کرو۔ جب تک رحمۃ للعالمین ﷺ نے عملاً وصف رحمت کو منتہائے کمال پر پہنچا کر نہیں دکھا دیا، اس وقت تک کیسے پتا چل سکتا تھا کہ رحم کی حقیقت اور اس کا کمال کیا ہے۔ نیز یہ کہ رحم کیسے، کس پر اور کس حد تک کیا جائے، حقیقت رحمت اور کمال رحمت کی مثال ذات مصطفوی نے یوں انسانیت کے سامنے پیش کی کہ جب طائف کے بازاروں میں حضور ﷺ کے جسم اقدس کو پتھروں سے زخمی اور نڈھال کر دیا گیا۔ آپ ﷺ لباس اطہر خون آلود ہوگیا اور آپ ایک دیوار سے ٹیک لگا کر نیچے آراء فرما ہوگئے تو حکم ایزدی سے پہاڑوں کا فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگا۔ یارسول اللہ اگر آپ چاہیں تو دو پہاڑوں کو نیچے گرا کر طائف کی بستی کو تباہ و برباد کر دیا جائے مگر آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا:

انما بعثت رحمة ولم ابعث عذاباً	میں صرف رحمت بن کر آیا ہوں عذاب نہیں۔
کنز العمال، ۱۱:۴۲۶، رقم: ۳۱۹۹۷	

آپ کے طرزِ عمل کے اس زاویے نے رحمت کے تصور کو ابدالاباد تک کے لئے نقطہ کمال تک پہنچا دیا تاکہ رحم کرنے والے اس عظمت سے سبق سیکھتے رہیں۔

۳۔ سچ بولنے کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل:

خداوند تبارک و تعالیٰ نے حکم دیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ○	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور اہلِ صدق (کی معیت) میں شامل رہو○
(التوبہ، ۹:۱۱۹)	

سچائی کا وہ عظیم تصور جو منشائے ایزدی کی تکمیل کرتا، اس وقت تک انسانیت کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا جب تک سچائی کا پیکرِ اتم رسالت مآب ﷺ کی شکل میں انسانیت کے سامنے نہ ہوتا۔ سرورِ کائنات ﷺ کس حد تک سچ بولتے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب آپ نے کوہِ صفا پر کفار و مشرکینِ مکہ سے پوچھا کہ اگر میں تمہیں اس پہاڑی کے پیچھے سے کسی حملہ آور لشکر کی خبر دوں تو کیا تم یقین کر لو گے سب نے بیک آواز کہا ہاں، اس لئے کہ:

ما جرّبنا عليک كذبا۔	ہم نے آپ کی ذات میں جھوٹ نہیں دیکھا
(صحیح البخاری، کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ اللھب، رقم: ۴٦٨٧)	

۴۔ ایفائے عہد کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل:

اسی طرح خدا تعالیٰ نے حکم دیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ۔	اے ایمان والو! (اپنے) عہد پورے کرو تمہارے لئے چوپائے جانور (یعنی مویشی) حلال کر دیئے گئے (ہیں)۔
(المائدہ، ۵:۱)	

وعدے کس انداز سے پورے کئے جائیں کہ ایفائے عہد کے قرآنی حکم کی تعمیل ہو سکے' جب تک کوئی اس معیار پر پورا اتر کر نہ دکھائے ایسا ممکن نہیں۔

حضرت عبداللہ بن ابی الحماء کہتے ہیں

کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں نبی اکرم ﷺ سے خرید وفروخت کا کوئی معاملہ کیا اور آپ سے کہا آپ ﷺ ذرا یہی ٹھہریئے' میں ابھی واپس آتا ہوں خدا کی قدرت کہ میں گھر جا کر بالکل بھول گیا۔ تین دنوں کے بعد اتفاقاً ادھر سے گزرا تو دیکھا کہ حضور ﷺ وہیں قیام فرمایں اور انتظار کر رہے ہیں مجھے دیکھا تو فرمایا:

لقد شققت علی أنا ھھنا منذ ثلاث إنتظرک۔

اے عبداللہ تو نے مجھے بہت مشقت میں ڈالا ہے۔ میں تین دن سے یہیں کھڑا تیرا انتظار کر رہا ہوں۔

(سنن ابی داؤد' ۴:۴۱۰' کتاب الادب' باب فی الوعد' رقم:۴۹۹۶)

چنانچہ ایفائے عہد کا حکم محض حکم نہ رہا بلکہ آپ کے عمل سے باقاعدہ مثالی نمونہ عمل کی صورت میں ڈھل گیا۔

۵۔ سادہ زندگی کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل:

اسلام نے سادگی اپنانے کی تعلیم دی ہے' یہاں تک کہ اختیاری فقر کو بھی حضور ﷺ نے باعث فخر قرار دیا ہے' لیکن اس حکم کی بجا آوری کے نقطہ کمال کا اندازہ۔ تاجدار کائنات کی حیات طیبہ کے اس گوشے پر نظر ڈالنے سے ہوتا ہے' جس کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں۔

كان ياتى علينا الشهر، ما نوقد فيه نارا، انما هو التمر و الماء۔
(صحیح البخاری، ۲:۹۵۶، کتاب الرقاق، باب کیف کان عیش النبی، رقم:۶۰۹۳)

ہم پر ایسے مہینے بھی گزرتے کہ ہم ان میں آگ تک جلا کر نہ دیکھتے، صرف کھجوروں اور پانی پر گزر ہوتی۔

۶۔ محنت و مساوات کا حکم اور آنحضور ﷺ کا عمل:

شریعت نے محنت و مشقت کو سراہا ہے اور تمام انسانوں کو خواہ کوئی بزعم خویش بڑا ہو یا چھوٹا، انسانی حیثیت میں برابر تسلیم کیا گیا ہے۔ محنت کی عظمت اور انسانی مساوات کا یہ سبق تو سب کو معلوم تھا لیکن اس کا معیاری نمونہ کمال کہاں سے میسر آئے؟

اس مقصد کی تکمیل خود ذات نبوی نے یوں کی کہ حضور ﷺ نے غزوہ خندق میں اپنے مبارک ہاتھوں سے خندق کھودی، پتھر اٹھائے اور اپنے کندھوں پر مٹی اٹھاتے رہے۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں:

كان رسول الله ينقل التراب يوم الخندق، حتى اغبر بطنه
(صحیح البخاری، ۲:۵۸۹، کتاب المغازی، باب غزوۃ الخندق، رقم:۳۸۷۸)

رسول اللہ خندق کے دن مٹی اٹھا کر لے جاتے رہے حتی کہ آپ کا بطن مبارک غبار آلود ہو گیا۔

صحابہؓ نے اسی روز بھوک کی شکایت کرتے ہوئے اپنے اپنے پیٹ سے کپڑا ہٹا کر ایک پتھر بندھا ہوا دکھایا تو حضورؐ نے اپنے بطن مبارک پر سے کپڑا ہٹا دیا تو دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فرفع رسول الله ﷺ عن حجرين

(جامع الترمذی، ۴:۵۸۵، کتاب الزھد، باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی ﷺ، رقم:۲۳۷۱)

اسی طرح جب مدینہ منورہ میں مسجد تعمیر ہوئی تو حضور بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح پتھر، مٹی، لکڑی اور اینٹ اٹھا کر لاتے رہے۔

صحابہ جنگ بدر کے لئے پیدل چلتے رہے حضور (ﷺ) کے ساتھیوں حضرت علیؓ اور حضرت مرثدؓ نے عرض کیا:

یا رسول اللہ: نحن نمشی عنک۔	یا رسول اللہ! آپ کے بجائے ہم پیدل چلتے ہیں۔

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

ما انتما باقوی علی المشی منی و ما انا باغنی عن الاجر منکما۔ (مسند احمد بن حنبل، ۱:۴۱۱)	تم مجھ سے چلنے میں زیادہ طاقتور نہیں ہو اور نہ میں اخروی اجر لینے میں تم سے زیادہ بے نیاز ہوں۔

نظام رسالت و نبوت کی غرض و غایت جہاں انسانوں کی فکری و عملی رہنمائی کرنا ہے، وہاں عملی اور واقعاتی رہنمائی بھی اسی سے ہی ممکن ہے۔ جس طرح حواس اور قوائے انسانی ادراک میں ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے، اسی طرح انسانی جسم اور اس کے اعضا احکام الٰہی کی کامل تکمیل سے قاصر رہتے ہیں تا آنکہ کوئی پیغمبر عملی رہنمائی کے ذریعے نمونہ عمل فراہم نہ کر دے۔

انبیاء و رسل کو بنی نوع انسان میں اسی لئے مبعوث کیا گیا کہ عبادات و معاملات اور مناکحات و معاہدات، الغرض زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق باری تعالیٰ کے احکامات کی عملی مثال ان نفوس قدسیہ کے ذریعے بنی نوع انسان تک پہنچ جائے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسانی ذہن از خود نہ احکام کو عملی شکل دے سکتا ہے اور نہ کسی بھی عمل کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا نظام رسالت کے ذریعے نہ صرف احکام الٰہی کی صورت گری کی گئی بلکہ انسانی عمل کی ایسی تکمیل بھی کر دی گئی کہ یہ ابدالآباد تک دنیائے انسانیت کے لئے نمونہ تقلید بن گئی اس کی پیروی سے انسان کو عظمت و شوکت حاصل ہوتی۔ اگر کوئی آج بھی دنیا و آخرت کی حقیقی کامیابی کا خواہاں ہے تو اسے نبوی اصولوں کی پیروی اختیار کرنا ہوگی۔

ایمان بالرسالت
کے تقاضے

ایمان بالرسالت کے عمومی اور خصوصی تصور کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے اور اس ایمان کے کامل ہونے کے بنیادی تقاضے کیا ہیں۔ ایمان باللہ کی طرح ایمان بالرسالت کے بھی دو مدارج ہیں:

۱۔ اصل ایمان: ۔ یہ وہ اساسی ایمان ہے جو نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کا زبان سے اقرار کرنے اور دل سے تصدیق کرنے کے ذریعے متحقق ہو جاتا ہے۔

۲۔ کمال ایمان: ۔ یہ ایمان کامل ہے جو بعض شرائط اور تقاضے صحیح طور پر پورے کئے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

۳۔ ایمان بالرسالت اقرار و تصدیق کی شرط پوری کرنے کے علاوہ درج ذیل چار تقاضوں سے مرکب ہے۔

ا۔ محبت رسول ﷺ

ب۔ تعظیم رسول ﷺ

ج۔ نصرت رسول ﷺ

د۔ اطاعت رسول ﷺ

ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے تحقیق اور ثبوت میں ایک قدر مشترک ہے اور ایک مختلف، جہاں تک اصل اور کمال کے مدارج کا تعلق ہے، دونوں ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابوامامہؓ اور حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

من احب لله و ابغض لله و اعطى لله و منع لله فقد استكمل الايمان۔	جس نے اللہ کے لئے کسی سے محبت کی اور اللہ کے لئے کسی کو کچھ دیا اور اللہ ہی کے لئے کسی سے کچھ روکا، پس اس نے ایمان مکمل کر لیا۔

ا۔ جامع الترمذی، ۴:۶۷۰، کتاب صفۃ القیامۃ، باب ۶۰، رقم: ۲۵۲۱

۲۔سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب الدلیل علی
زیادۃ الایمان ونقصانہ، ۴: ۲۲۰، رقم: ۴۶۸۱

حالانکہ ان شرائط پر پورا نہ اترنے کے باوجود اس کا اللہ پر ایمان رکھنا اصلاً ثابت ہوتا ہے مگر ناقص رہ جاتا ہے۔ جہاں تک ایمان بالرسالت میں اصلِ ایمان اور کمالِ ایمان کے تعین اور ان کے ثبوت کی حدود کا تعلق ہے، اس میں اس کی حیثیت مختلف ہے۔ مذکورہ بالا چار شرائط اور تقاضوں میں سے پہلے دو (محبت اور تعظیم) اصلِ ایمان کا حصہ ہیں جبکہ بقیہ دو (اطاعت اور نصرت) کمالِ ایمان کا حصہ ہیں۔

اگر نبی اکرم ﷺ کی ذات اقدس کے ساتھ سرے سے محبت ہی نہ ہو، بلکہ قلبی اور باطنی سطح پر ایک طرح کی لاتعلقی یا عدم رغبت کی کیفیت ہو اور نہ ہی دل میں آپ کی تعظیم کا کوئی داعیہ موجود ہو تو ان خصائص کا فقدان مطلقاً ایمان ہی کی نفی کو مستلزم ہوگا۔ اس کے برعکس اگر محبت رسول ﷺ اور تعظیم رسول ﷺ کے عناصر انسان کی طبعیت میں پائے جائیں، مگر بدقسمتی سے اطاعت اور نصرت کی توفیق نہ ہو تو پھر ایمان اصلاً تو ثابت ہوگا مگر ناقص رہ جائے گا۔ اس کا کمال بلکہ خود داعیاتِ محبت و تعظیم کا کمال اطاعت اور نصرت کے بغیر ممکن نہیں۔ ہاں محبت اور تعظیم میں پھر دو مدارج ہیں:

۱۔ محض محبت و تعظیم

۲۔ شدید محبت و تعظیم

اگر حضور علیہ السلام کی ذات سے محض اس قدر محبت اور تعظیم کا تعلق ہو کہ انسان کا دل آپ کی یاد سے کچھ مانوس ہو، آپ کے ذکر سے کچھ لذت اور سکون پائے اور اس کے اندر ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کی گستاخی و بے ادبی کا شائبہ نہ ہو تو وہ صاحب ایمان تصور کیا جائے گا اور اگر یہی محبت و تعظیم اس کے قلب و باطن میں زور پکڑ جائے اور اتنی شدت اختیار کر جائے کہ نہ تو کسی مخلوق کی محبت واقعۃً آپ کی محبت کا مقابلہ کر سکے اور نہ ہی کسی کی تعظیم تو پھر اس ایمان کو ایمان کامل تصور

کیا جائے گا۔ اب ہم ان چاروں تقاضوں کا اختصار کے ساتھ جداگانہ ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ محبت رسول ﷺ

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَO

(التوبۃ۹:۲۴)

(اے نبی مکرم) آپ فرما دیں اگر تمہارے باپ (دادا) اور تمہارے بیٹے (بیٹیاں) اور تمہارے بھائی (بہنیں) اور تمہاری بیویاں اور تمہارے (دیگر) رشتہ دار اور تمہارے اموال جو تم نے (محنت سے) کمائے اور تجارت و کاروبار جسکے نقصان سے تم ڈرتے رہتے ہو اور وہ مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو، تمہارے نزدیک اللہ اور اسکے رسول اور اسکی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (عذاب) لے آئے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں فرماتاo

اس آیت کریمہ میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کو دنیا و مافیہا کی ساری محبتوں سے فائق و برتر قرار دیا گیا ہے اور اسے ہی علامت ایمان و ہدایت کہا گیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ خود ارشاد فرماتے ہیں:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من والده و ولده والناس

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار نہیں ہوسکتا، جب تک وہ مجھ

اجمعین۔

۱۔صحیح البخاری، ۱:۲۷، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان، رقم:۱۵

۲۔صحیح لمسلم، ۱:۴۹، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ، رقم:۶۹

سے اپنے والدین، اولاد بلکہ تمام انسانوں سے بڑھ کر محبت نہ کرے۔

عبداللہ بن ہشامؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور ﷺ کے ہمراہ تھے۔آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور فرما رہے تھے:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیه من نفسه۔

(مسند احمد بن حنبل، ۴:۲۳۳)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان دار نہیں ہوسکتا جب تک مجھے اپنی جان سے بڑھ کر محبوب نہ رکھے۔

کیونکہ محبت رسول ﷺ ایمان بالرسالت کی بنیاد تھی، اس لئے صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ کے دست اقدس پر محبت کی بیعت کرتے تھے۔جیسا کہ حضرت صفوان بن قدامہ رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کی بارگاہ میں عرض کیا:

یا رسول الله: ناولنی یدک، ابایعک، فناولنی یده، فقلت: یارسول الله انی احبک، قال: المرء مع من احب۔

(الشفاء، ۲:۵۶۵)

یا رسول اللہ! اپنا دست اقدس میرے آگے کیجئے، میں آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ﷺ نے اپنا دست اقدس میرے آگے بڑھایا۔ میں نے بیعت کرتے ہوئے عرض کیا: یارسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے۔حضور علیہ الصلوۃ و السلام نے فرمایا: آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہوگی۔

یہی ارشاد نبوی ﷺ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ابوموسیٰ اشعریؓ انس بن مالک اور ابوذر غفاری رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے حالات ایمان کی سب سے پہلی شرط یہ قرار دی:

ان یکون اللہ و رسولہ احب الیہ مما سوا ھما۔ کہ انسان کائنات کی ہر شے سے بڑھ کر محبت اللہ اور اس کے رسول سے کرے۔

۱۔صحیح البخاری، ۱: ۷، کتاب الایمان، باب حلاوۃ الایمان، رقم:۱۶

۲۔صحیح لمسلم، ۱:۴۹، کتاب الایمان، باب بیان خصال من اتصف بھن وجد حلاوۃ الایمان، رقم:۴۳

قاضی عیاضؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث بھی روایت کی ہے:

من احبنی کان معی فی الجنۃ۔ جس نے مجھ سے محبت کی وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (الشفاء، ۲:۵۶۶)

محبت چونکہ دل کی کیفیت سے عبارت ہے، اس لئے آنکھوں سے دیکھی نہیں جاسکتی۔ لہذا اس کی علامات سے اس کے وجود کا پتہ چلایا جاسکتا ہے۔ ائمہ حدیث نے محبت کی درج ذیل علامات بیان کی ہیں جو صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں بتمام وکمال دکھائی دیتی ہیں:

۱۔ کثرت ذکر: محبت کی سب سے پہلی علامت یہ ہے کہ محبوب کا ذکر اور اس کی یاد کثرت سے کی جائے بلکہ دل ہمہ وقت یادِ محبوب سے معمور رہے۔

۲۔شوق زیارت: دوسری علامت یہ ہے کہ محبوب کے جلوہ و دیدار کی خواہش ہمیشہ دل میں شدت سے رہے۔

۳۔تعظیم وتوقیر: محبوب کی عزت وتکریم اور تعظیم وتوقیر انتہا درجے کی ہو۔ محبوب کی شخصیت

کے کسی بھی پہلو کو عیب دار یا ناقص تصور نہ کیا جائے' تا کہ ادب واحترام میں کوئی کمی واقع نہ ہونے پائے۔ گویا اسے محبوب کی ہر خوبی منتہائے کمال پر دکھائی دے' کسی اعتبار سے بھی کم نظر نہ آئے۔

۴۔ خشوع وخضوع: محبوب کا نام اراس کے فضائل ومحاسن سن کر دل میں بڑی راحت و سکون' لذت وحلاوت اور خشوع وخضوع کی کیفیت پیدا ہو اور محبوب کے لئے بڑی انکساری اور تواضع کا اظہار کیا جائے۔

۲۔ تعظیم رسول ﷺ:

اس سلسلے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَO

پس جو لوگ اس (برگزیدہ رسول) پر ایمان لائیں گے جو ان کے ساتھ اتارا گیا ہے' وہی لوگ ہی فلاح پانے والے ہیں۔

(الاعراف' ۷:۱۵۷)

اس آیت کریمہ میں دوسرا تقاضا ایمان تعظیم رسول ﷺ کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے تعظیم رسول ﷺ کے کئی آداب اور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے' جن میں چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖO

اے ایمان والو! تم اللہ اور اسکے رسول سے (کسی معاملہ میں) سبقت نہ کیا کروo

(الحجرات' ۴۹:۱)

صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اس امر سے پاک ہے کہ کوئی شخص اس سے پہل کرے' پھر یہ حکم بھی اس وقت اتارا گیا' جب کچھ لوگوں نے حضور ﷺ سے پہلے اپنی قربانی کر لی۔ یہ پہل تو فی الواقع صرف عملِ رسول سے تھی۔ جسے باری تعالیٰ نے امت کے لئے تقاضائے تعظیم رسالت کے خلاف سمجھا اور تعظیم رسول کی خلاف ورزی کو خود تعظیم الوہیت کی خلاف ورزی قرار دیا۔

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا:

۲۔لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ (النور،۲۴:۶۳)	(اے مسلمانو!) تم رسول کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کی مثل قرار نہ دو۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ باری تعالیٰ اپنے محبوب کو عامیانہ انداز سے پکارے جانے کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے؟ جب اس نے خود بھی پورے قرآن میں حضورﷺ کو تعظیمی القاب اور پیار بھرے خطابات کے بغیر کبھی نہیں پکارا، کبھی وہ ''یا ایھاالنبی'' کہہ کر پکارتا ہے، کبھی ''یا ایھا الرسول''، کبھی ''یا ایھا المزمل'' کہہ کر یاد کرتا ہے، کبھی یا ایھا المدثر، کبھی یسٓ، کبھی طٰہٰ جبکہ دیگر تمام انبیاء کو ہمیشہ نام لے کر بلایا جاتا ہے۔مثلاً یا ادم، یا نوح یا ابراھیم، یا موسیٰ، یا داؤد، یا عیسیٰ۔

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر حضورﷺ کو نام لے کر پکارنے کی بجائے یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ جیسے القاب سے پکارنے کی تلقین کی گئی ہے۔اسی میں پاسِ ادب ہے۔

مزید ارشاد فرمایا گیا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَO (الحجرات،۴۹:۲)	اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبیﷺ کی آواز سے بلند نہ کیا کرو۔اور دن سے زور سے نہ بولو جیسے آپس میں زور زور سے بولتے ہو کہیں تمہارے اعمال ضائع نہ ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہوo

یہاں تعظیم رسول ﷺ کا کتنا بڑا ادب سکھایا جارہا ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کی جارہی ہے کہ بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں معمولی سی بے ادبی بھی جو صرف آواز بلند کرنے سے ہوسکتی ہے، ساری زندگی کے نیک اعمال اور عبادات کو غارت کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان دولت ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید کا یہ فیصلہ ہے کہ اعمال صرف کفر سے غارت ہوتے ہیں۔ اس کے سوا کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہوتے۔ کیونکہ مسلمان جس قدر بھی گنہگار اور فاسق و فاجر کیوں نہ ہو، وہ اخروی زندگی میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر بالآخر جنت میں ضرور جائے گا۔ چنانچہ اگر اسکے سارے اعمال غارت ہو جاتے تو نتیجۃً اس کا ایمان بھی نہ بچتا۔ لہذا وہ کبھی بھی دوزخ سے نکل کر جنت میں داخل نہ ہوسکتا کیونکہ اعمال غارت ہو جانے سے ہمیشہ دوزخ میں رہنا لازم ہو جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ وَ فِی النَّارِ ھُمْ خٰلِدُوْنَO	ان لوگوں کے تمام اعمال باطل ہو چکے ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ ہی میں رہنے والے ہیںo
(التوبہ ۹:۱۷)	

بڑے سے بڑا گناہ بھی اپنا اثر اور سزا تو ضرور مترتب کرتا ہے، لیکن تمام اعمال صالحہ کی نفی نہیں کرسکتا۔ اس لئے مومن بالآخر جنت کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مگر بارگاہ مصطفویت کی بے ادبی صرف گناہ نہیں بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ تمام اعمال کا غارت ہونا محض گناہ کی نہیں بلکہ کفر کی تاثیر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُہٗ۔	اور جو شخص (احکام الٰہی پر) ایمان (لانے) سے انکار کرے تو اس کا سارا عمل برباد ہو گیا۔
(المائدہ ۵:۵)	

اسی طرح ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَO

اور اگر (بالفرض) یہ لوگ شرک کرتے تو ان سے وہ (سارے اعمال خیر) ضبط ہو جاتے جو وہ انجام دیتے تھے۔

(الانعام ۶:۸۸)

ایک اور مقام پر ارشاد ایزدی ہے:

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْO

جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا اللہ نے ان کے اعمال غارت کر دیئے۔

(محمد ۴۷:۱)

جب مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں یہ امر طے پا گیا کہ بارگاہ نبوت کی بے ادبی، تمام اعمال کو غارت کرنے کا باعث ہوتی ہے، چونکہ تمام اعمال صرف کفر سے ہی غارت ہوتے ہیں، اس لئے آنحضرت ﷺ کی بے ادبی صریح کفر قرار پائی اور نتیجۃً آپ کی تعظیم عین ایمان۔

اس لئے حضور ﷺ کی محبت اور تعظیم، صرف ایمان کے کمال کا ہی نہیں بلکہ اصلاً ایمان کے ثبوت اور تحقق کا باعث ہیں۔ ان دو تقاضوں کو پورا کئے بغیر ''ایمان بالرسالت'' کا وجود ہی سرے سے محل نظر رہتا ہے۔

۳۔ نصرت رسول ﷺ:

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ مشن کی خدمت کو قرآنی اصطلاح میں نصرت رسول ﷺ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ ایمان بالرسالت کا چوتھا تقاضا ہے ''**نصروہ**'' سے یہی مراد ہے۔ حضور علیہ السلام کی بعثت سعیدہ کا مقصد **لیظھرہ علی الدین کلہ** (اس دین حق کو تمام ادیان عالم پر غالب و فائق کرنا تھا) اس لحاظ سے آپ ﷺ کے مشن کے دو پہلو تھے:

۱۔ دین اسلام کی ظاہری شوکت اور سیاسی تمکنت کے تحفظ کا پہلو

۲۔ دین اسلام کی عملی، اخلاقی اور روحانی اقدار کے تحفظ کا پہلو

آپ ﷺ کے وصال کے بعد امت مسلمہ کو حضور ﷺ کی خلافت و نیابت دو طرح سے عطا کی گئی:

۱۔ ظاہری خلافت

۲۔ باطنی خلافت

اسلام کی مادی، سیاسی اور ظاہری شان و شوکت اور عظمت و تمکنت کے تحفظ اور فروغ کی جدوجہد ظاہری خلافت ہے۔ جب کہ اسلام کی عملی، مذہبی اور روحانی زندگی کے احیاء، تجدید اور تحفظ کی جدوجہد باطنی خلافت ہے۔ اپنی جان و مال، ممکنہ وسائل و ذرائع اور علم و عمل کی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مصطفوی مشن کی خدمت میں ہمہ وقت مستعد رہنا یہی حقیقی تبلیغ اور جہاد ہے۔ اسی لئے سورۃ توبہ کی آیت کریمہ میں ''محبت'' کے تین عناصر بیان کئے گئے ہیں ''اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ جِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ'' جس کا معنی یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شی اور منفعت خدا کی محبت، رسول کی محبت اور جہاد کی محبت یعنی پیغمبرانہ مشن کی خدمت سے زیادہ عزیز اور محبوب نہیں ہونی چاہیے۔ (التوبۃ 9:۲۴)

پیغمبرانہ مشن کی خدمت و مدد کا یہی تصور کئی مقامات پر قرآن مجید میں یوں مذکور ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ ھَاجَرُوْا وَ جٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَاللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ O	جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں سے جہاد کرتے رہے وہ اللہ کی بارگاہ میں درجہ کے لحاظ سے بڑے ہیں اور وہی لوگ ہی مراد کو پہنچے ہوئے ہیں O
(التوبۃ 9:۲۰)	

۴۔اطاعت رسول ﷺ:

آیت مذکورہ بالا میں آخری شرط اور ادب کو ''واتبعوا النور الذی انزل معہ'' کے الفاظ کی صورت میں واضح کیا گیا ہے۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اطاعت واتباع رسول ﷺ ایمان بالرسالت کا آخری اور تکمیلی تقاضا ہے۔اس کے بغیر نہ محبت وتعظیم کا عنصر مکمل ہوتا ہے،اور نہ نصرت وخدمت کا،اس لئے ہر جگہ ایمان کے ساتھ اطاعت واتباع کا حکم ضرور صادر کیا گیا ہے۔ ارشادِ ایزدی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ۔ (الانفال،۸:۲۰)	اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔
اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَO (آل عمران،۳:۳۲)	اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو، تا کہ تم پر رحم کیا جا سکے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

اِنْ تُطِیْعُوْهُ تَهْتَدُوْا۔ (النور،۲۴:۵۴)	اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔
مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ (النساء،۴:۸۰)	جو کوئی رسول کی اطاعت کرے گا وہی اللہ کا مطیع ہوگا۔

ان تمام مباحث سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ ایمان بالرسالت کے تمام تقاضے پورے کئے بغیر کوئی بھی مسلمان اپنے ایمان کی تکمیل کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔کوئی بھی مسلمان ایمان کی حقیقت اور روح کو تبھی پا سکتا ہے جب وہ حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ اپنے تعلق اور نسبت کو پختہ کر لے۔حضور نبی کریم ﷺ کی اتباع ہی اصل ایمان ہے۔حضور نبی کریم ﷺ کے دین کی سرفرازی کے لئے جدوجہد کرنا کامل ایمان کی سند ہے۔

إشاريه

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	آیاتِ طیبات	۸۳
۲	أحادیث و آثار	۹۱
۳	أعلام	۹۵
۴	مآخذ و مراجع	

آیاتِ طیبات

نمبر شمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
	الفاتحه: ۱		
۱	الحمد لله رب العالمينO	۱:۱	۱۵
	البقره: ۲		
۲	ولكم فی الأرض مستقرو متاع...	۲:۳۶	۲۲
۳	فاما يأتينكم منی هدی فمن...	۲:۳۸	۴۴
۴	و أقيموا الصلاة و أتوالزكوة...	۲:۴۳	۴۶
۵	والذين أمنوا اشد حبا لِلّهO	۲:۱۶۵	۱۸
۶	كل أمن بالله وملئكة وكتبه...	۲:۲۸۵	۱۲
	آل عمران: ۳		
۷	قل إن كنتم تحبون الله فاتبعونی...	۳: ۳۱	۴۶
۸	أطيعوا الله والرسول لعلكم ترحمونO	۳:۳۲	
۹	ولِلّه علی الناس حج البيت ...	۳:۹۷	۵۵
۱۰	ربنا ما خلقت هذا باطلا۔	۳:۱۹۱	۱۸
	النساء : ۴		
۱۱	يايهأ الناس اتقوا ربكم الذی...	۴: ۱	۴۰
۱۲	فانكحوا ما طاب لكم من النساء...	۴: ۳	۴۷
۱۳	فكيف إذا جئنا من كل أمة بشهيد...	۴: ۴۱	۱۶
۱۴	يايهأ الذين أمنوا أطيعواالله و أطيعوا...	۴: ۵۹	۴۵
۱۵	وما أرسلنا من رسول الا ليطاع...	۴: ۶۴	۴۳
۱۶	من يطع الرسول فقد أطاع الله...	۴: ۸۰	۴۸

۱۷	إن الصلاة كانت على المومنين كتابا...	۱۰۳:۴	۵۲
نمبرشمار	أطراف الآيات	حواله	صفحه
۱۸	ليس بأما نيكم والا أماني أهل الكتاب...	۱۲۳:۴	۴۴
۱۹	رسلا مبشرين و منذرين لئلايكون للناس...	۱۶۵:۴	۱۳
	المائده: ۵		
۲۰	يايها الذين أمنوا اوفوا بالعقود...	۱:۵	۶۰
۲۱	ومن يكفر بالايمان فقد حبط عمله...	۵:۵	۷۴
	الانعام: ۶		
۲۲	ولوأشركوا لحبط عنهم ما كانوا يعملونO	۸۸:۶	۷۵
۲۳	و ما قدرو اللّٰه حق قدره ما انزاللّٰه...	۹۱:۶	۲۱
	الاعراف: ۷		
۲۴	ولقد مكنكم فى الارض و جعلناكم فيها...	۱۰:۷	۲۲
	فالذين امنوا به و عزروه و نصروه...	۱۵۷:۷	۷۲
۲۵	اولم ينظروا فى ملكوت السموات ...	۱۸۵:۷	۱۷
	الانفال: ۸		
۲۶	وأطيعوا اللّٰه و الرسول ان كنتم مومنينO	۱:۸	۴۶
۲۷	يايها الذين أمنوا اطيعوا اللّٰه رسوله...	۲۰:۸	۷۷
۲۸	وما كان صلاتهم عندالبيت الابكاء...	۳۵:۸	۵۴
	التوبه: ۹		
۲۹	أولئک حبطت أعمالهم و فى النار...	۱۷:۹	۷۴
۳۰	ألذين أمنوا و هاجروا و جاهدوا...	۲۲:۹	۷۶

۳۱	قل إن كان آبائكم و أبناء كم و أخوانكم...	۹ : ۲۴	۶۹
۳۲	وصل عليهم إن صلاتک سكن لهم...	۹ : ۱۰۳	۵۳
نمبر شمار	**أطراف الآيات**	حواله	صفحه
۳۳	وقل إعملوا فسيرى اللّٰه عملكم و رسوله...	۹ : ۱۰۵	۴۳
۳۴	يايها الذين أمنوا اتقواللّٰه و كونوا...	۹ : ۱۱۹	۶۰
	ابراهيم: ۱۴		
۳۵	وما ارسلنا من رسول الا بلسان...	۱۴ : ۴	
	النحل : ۱۶		
	وان تعدوا نعمة الله لا تحصوها.	۱۶ : ۱۸	۲۹
	بنى اسرائيل:۱۷		
۳۶	وما كنا معذبين حتى نبعث رسولاO	۱۷ : ۱۵	۱۴
۳۷	و ما أوتيتم من العلم الاقليلاO	۱۷ : ۸۵	۳۷
	الكهف: ۱۸		
۳۸	ومأ نرسل المرسلين الامبشرين و منذرين...	۱۸ : ۵۶	۱۴
	الانبياء: ۲۱		
۳۹	وجعلنا من الماء كل شى حى...	۲۱ : ۳۰	۴۱
۴۰	ونضع الموازين القسط ليوم القيامة...	۲۱ : ۴۷	۲۴
۴۱	وما أرسلنا الا رحمة للعالمينO	۲۱ : ۱۰۷	۱۵
	المومنون:۲۳		
۴۲	أفحسبتم انما خلقناكم عبثا و انكم...	۲۳ : ۱۱۵	۱۸
	النور: ۲۴		

۴۳	إن تطيعوه لتهدوا...	۲۴ : ۵۴	۷۳
۴۴	لا تجعلوا دعاء الرسول بينكم كدعاء...	۲۴ : ۶۳	۷۷
نمبرشمار	**أطراف الآيات**	حواله	صفحه
	الفرقان: ۲۵		
۴۵	تبارک الذی نزل الفرقان علی عبده...	۲۵ : ۱	۱۵
	الشعراء: ۲۶		
۴۶	فأتبعوهم مشرقينO	۲۶ : ۶۰	۴۵
	الاحزاب: ۳۳		
۴۷	لقد كان لكم فی رسول اللّٰه اسوة حسنه...	۳۳ : ۲۱	۵۸
	سبا: ۳۴		
۴۸	ولقد صديق عليهم ابليس ظنه...	۳۴ : ۲۰	۴۶
۴۹	وما ارسلنا الاكافة للناس بشيرا...	۳۴ : ۲۸	۱۵
	فاطر: ۳۵		
۵۰	وان من امة الا خلافيهانذيرO	۳۵ : ۲۴	۱۲
	يٰسٓين: ۳۶		
۵۱	والشمس تجری لمستقرلها ذالک تقدير...	۳۶ : ۳۸	۲۳
	محمد: ۴۷		
	الذين كفروا و صدوا عن سبيل اللّٰه...	۷۷ : ۱	۷۵
۵۲	والذين امنوا و عملوا اصلحت و أمنوا ...	۴۷ : ۲	۳۹، ۴۱

	الحجرات: ۴۹		
۵۳	یایها الذین امنوا لا تقدموا بین یدی اللّٰه...	۱:۴۹	۷۲
۵۴	لا ترفعوا أصواتکم فوق صوت النبی...	۲:۴۹	۷۳
	الذاریات: ۵۱		
۵۵	وما خلق الجن والانس الالیعبدونO	۵۶:۵۱	۱۹
نمبرشمار	أطراف الآیات	حواله	صفحه
	النجم: ۵۳		
۵۶	وان لیس للانسان الاما سعیO	۳۹:۵۳	۲۳
	الملک : ۶۷		
۵۷	وجعل لکم السمع والا بصار والافئدة...	۲۳ : ۶۷	۲۳
	القیامة: ۷۵		
۵۸	أیحسب الانسان ان یترک سدیO	۳۶ : ۷۵	۲۳
	النباء: ۷۸		
۵۹	و انزلنا من المعصرات ماء تجاجا لتخرج...	۱۴:۷۸	۲۲
	الانفظار: ۸۲		
۶۰	یأیها الانسان ما غرک بربک الکریم...	۶:۸۲	۲۰
	البلد: ۹۰		
۶۱	ألم نجعل له عینینO و لسانا و شفتینO	۹۰:۹_۸	۲۲
۶۲	وهدیناه النجدینO	۱۰:۹۰	۲۳
	الشمس: ۹۱		
۶۳	فالهمها فجورها و تقوهاO	۸:۹۱	۲۳

التین: ۹۵

۶۴	**لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویمO**	۹۵:۴	۲۰

أحاديثِ مبارکه

نمبر شمار	أطراف الأحاديث والآثار	صفحه
۱	أن النبی إذا أراد سفرا اقرع ...	۵۸
۲	أن یکون أللّٰه و رسوله أحب الیه ...	۷۱
۳	إنمابعثت رحمة لم أبعث عذابا...	۵۹
۴	بعثت بالحنفیة السمحة...	۵۰
۵	ترکت فیکم أمرین کتاب اللّٰه و سنة رسوله...	۴۹
۶	خذو عنی منا سککم...	۵۵
۷	صلوا کما رأیتمونی أصلی...	۵۴
۸	فرفع عن بطنه عن حجرین...	۶۲
۹	کان رسول اللّٰه یقسم بین ازواجه...	۵۹
۱۰	کان یأتی علینا الشهر ما نوقد فیه نارا...	۶۱
۱۱	کان رسول اللّٰه ینقل التراب یوم الخندق...	۶۲
۱۲	کان خلقه القرآن...	۴۹
۱۳	لا یومن أحدکم حتی أکون أحب الیه...	۴۹
۱۴	لا یومن أحدکم حتی یکون هواه تبعا...	۴۸
۱۵	لقد شققت علی أنا ههنا منذ ثلاث...	۶۱
۱۶	ما انتما با قوی علی المشی فی و ما أنا ...	۶۳
۱۷	ما جربنا علیک کذبا...	۶۰
۱۸	المرء مع من احب...	۷۰
۱۹	من أحب اللّٰه و البغض لِلّٰه...	۶۷
۲۰	من احبنی کان معی فی الجنة...	۷۱
۲۱	یارسول الله! احقرت الصلوة ام نسیت...	۵۶

کتابیات

نمبر شمار	أعلام	صفحہ
۱	آدم علیہ السلام	۷۳
۲	أبو امامہؓ	۶۷
۳	أبو بکر صدیقؓ	۵۵
۴	أبو ذر غفاریؓ	۷۱
۵	أبو موسی اشعریؓ	۷۱
۶	احمد دھلوی، سید	۳۱
۷	انس بن مالکؓ	۷۱
۸	براء بن عازبؓ	۶۲
۹	داؤد علیہ السلام	۷۳
۱۰	ڈارون	۱۹
۱۱	ذوالیدینؓ	۵۶
۱۲	راغب اصفھانیؒ	۱۲، ۵۰
۱۳	رومؒ، مولانا	۲۸
۱۴	زید	۳۸
۱۵	سعدیؒ، شیخ	۲۸
۱۶	صفوان بن قدامہؓ	۷۰
۱۷	عائشہ صدیقہؓ	۶۱
۱۸	عبداللہ ابن مسعودؓ	۷۱
۱۹	عبداللہ بن ابی الحمساءؓ	۶۱
۲۰	عبداللہ بن ھشام	۶۹

نمبر شمار	أعلام	صفحہ
۲۱	علیؓ	۶۲
۲۲	عمر فاروقؓ	۵۵
۲۳	عمروؓ	۳۸
۲۴	عیسی علیہ السلام	۷۳
۲۵	غزالیؒ	۳۸،۳۵
۲۶	قاضی عیاضؒ	۷۱
۲۷	لومیروسو	۱۹
۲۸	مرثدؓ	۶۲
۲۹	معاذ بن انسؓ	۶۷
۳۰	موسی علیہ السلام	۷۳
۳۱	نوح علیہ السلام	۷۳

اشعار

نمبر شمار	اشعار	صفحه
	نه هر جا که مرکب تواں تاختن که جا ها سپر باید انداختن	

کتابیات

کتاب	مصنف/متوفی	مطبوعہ/سن طباعت
القرآن الکریم	منزل من اللہ	
صحیح البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاری، ۲۵۶ھ	بیروت، دارالقلم (۱۹۸۱)
صحیح لمسلم	امام ابوالحسین مسلم بن حجاج القشیریؒ، ۲۶۱	بیروت، دارالاحیاء التراث، ۱۹۵۴ء
سنن ابی داؤد	امام ابو داؤد سلیمان بن اشعثؒ، ۲۷۵ھ	بیروت دارالاحیاء التراث العربی
سنن ابن ماجہ	امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، ۲۷۳ھ	بیروت دارالاحیاء التراث العربی، ۱۹۷۵ء
الشفاء	قاضی عیاض بن موسیٰ المالکیؒ، ۵۰۲ھ	بیروت، دارالکتاب العزلی، ۱۹۷۷ء
المفردات	حسین بن محمد راغب اصفہانیؒ	بیروت، دارالقلم، ۱۹۹۲ء
لسان العرب	امام ابو الفضل جمال الدینؒ، ۷۱۱ھ	بیروت، دار صادر، ۱۳۰۰ھ
گلستان	شیخ سعدی شیرازیؒ، ۶۹۰ھ	مکتبہ شرکت علمیہ، ملتان
المنقذ من الضلال	امام محمد بن غزالیؒ، ۵۰۵ھ	لاہور۔ ۱۴۰۵ھ